ایک علمی تحریک کا دینی
علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان
ماہنامہ
ندائے اعتدال
علی گڑھ
فروری ۲۰۱۴ء
20:00
ایڈیٹر
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	اداریہ	اولاد کی تعلیم وتربیت	مدیر	۳
۲۔	گوشہ سیرت	قرآن کریم کی امتیازی صفات	مسٹر اڈیار، مترجم: ایم، اے، جمیل احمد	۷
۳۔	// //	کوئی آیا نہ مگر رحمت عالم بن کر	مولانا محمد سراج الہدیٰ ندوی ازہری	۱۰
۴۔	تاریخ کے جھروکوں سے	عہد اسلامی کے شفاخانے (آخری قسط)	تحریر: مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی تعلیق وترجمہ: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۲۴
۵۔	بحث ونظر	دینی نصاب تعلیم کی بنیادی خصوصیات	محمد جرجیس کریمی	۲۶
۶۔	تعلیم وتربیت	مسلم والدین کا اپنی اولاد کے ساتھ برتاؤ	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۳۰
۷۔	// //	مثالی استاذ	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۴۲
۸۔	تعلیمات اسلام	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	ابوسعد اعظمی	۵۱
۹۔	تذکرہ	مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور دینی تعلیمی کونسل...	مولانا طارق شفیق ندوی	۵۵
۱۰۔	اصلاح معاشرہ	موبائل اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے	مولانا ندیم احمد انصاری	۵۹

❁ ❁ ❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

اولاد کی تعلیم وتربیت

''اولاد کی تعلیم وتربیت'' ایک ایسا اہم، نازک وحساس اور ذمہ دارانہ عمل ہے، جس سے پہلوتہی انسان کے لئے دنیا وآخرت میں وبالِ جان ثابت ہوسکتی ہے، اس کے برعکس اگر اس میں تربیتی اصولوں اور مبادی اسلام کی رعایت کے ساتھ دلچسپی لی جائے تو یہی اولاد دنیا میں آنکھوں کی ٹھنڈک، ذخیرہ آخرت اور صدقۂ جاریہ بن سکتی ہے،(۱) قرآن حکیم نے زندگی کے مختلف مراحل کا تذکرہ کیا ہے، بچپن کے زمانہ کا تذکرہ کرکے، اس کے تحفظات، بچوں سے محبت اور ان کی تربیت کے بھی اشارے دئے ہیں، ان کے حقوق، ان کی تربیت، اور اخلاقی وتادیبی ہدایات عطا کی ہیں، قرآن کا یہ معجزانہ اسلوب بیان اور حکیمانہ ارشاد دیکھئے "إنما أموالكم وأولادكم فتنة والله عنده اجر عظيم" (۲) اولاد کی اہمیت اس طور پر قرآن نے بیان کردی کہ اگر ان کی تعلیم وتربیت پر توجہ دی گئی اور قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح تربیت کے مراحل سے گذارا گیا تب تو یہ اولاد اللہ کے خزانے سے اجر عظیم کے استحقاق کا باعث بنے گی، بصورت دیگر وبال جان ہی نہیں ثابت ہوگی بلکہ بسا اوقات یہی اولاد زندگی اجیرن کردیتی ہے اور والدین موت کی خواہش کرنے لگتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ اس کے پس پردہ ان کی تربیت میں والدین کی کوتاہی کارفرما ہوتی ہے۔

اولاد کی تربیت اور تعلیم ایک فن ہے، اور بہت نازک فن ہے، بچہ کی مثال خوبصورت پودے کی سی ہے، اگر اس کی تراش خراش میں مالی نے چمن بندی اور باغبانی کے اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے محنت کی تو پودا چمن کا ایک خوبصورت حصہ بنے گا ورنہ وہ ایک بدصورت جنگلی گھاس کی شکل اختیار کرکے چمن کے حسن کو بھی غارت کردے گا، اسی مالی کی طرح والدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کی آیات، حضور پاک علیہ الصلوۃ والسلام کے تربیتی منہج اور تعامل سلف کے ساتھ زمانے کے تقاضوں اور بچے کی نفسیات سے واقف ہوں اور یہ سوچ کر تربیت کریں کہ یہ اولاد ان کے لئے صدقہ جاریہ بن سکتی ہے، بشرطیکہ وہ صاحب کردار اور دیندار بن جائے، ورنہ پھر اس کے گناہوں اور اس کی تمام سیئات میں حصہ ہوگا کیونکہ حدیث میں صاف ارشاد ہے، "كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته" (۳) اور فرمایا "ان الله سائل كل راع عما استرعاه ،أحفظ أم ضيع؟حتىٰ يسأل الرجل عن اهل بيته" (۴) اور اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ امام مسلمؒ کی روایت میں یہ ذمہ داری سمجھائی گئی ہے، "من دعا الى هدى كان له من الاجر مثل أجور من تبعه لا ينقص ذٰلك من أجورهم شيئا ،ومن دعا الىٰ ضلالة كان عليه من الاثم مثل اٰثا م من تبعه لا ينقص ذٰلك من اٰثا مهم شيئا "(۵)

مذکورہ بالا واضح اشارات وہدایات کے علاوہ خود حقوق اولاد کے عنوان سے متعدد ہدایات دی گئی ہیں، جن کی روشنی میں یہ سمجھنا چاہئے کہ قرآن وسنت میں تربیت اولاد کے اصول متعین ہیں، ان کو بنیاد بنا کر نفسیات اور زمانے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی ایسی تربیت ہونی چاہئے کہ وہ دین کے علمبردار وخادم، ملت کی امید، والدین اور اعزاء واقرباء کے لئے باعث فرحت وانبساط بننے کے ساتھ مستقبل کی امید بن جائیں، ظاہر ہے کہ اولادیں ''مستقبل کی امید اور امیدوں کا مستقبل ہوتی ہیں''۔

عام طور سے اس نازک وحساس فن کی بنیادی بلکہ ضروری معلومات بھی نہ ہونے کے سبب بچوں کی تربیت میں بڑی کوتاہی ہوتی ہے، دیکھا گیا ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی اولادیں بھی بے کار ہوتی ہیں، خود انکے لئے مفید ثابت نہیں ہو پاتی ہیں، نہ ان کا کوئی وقار ہوتا ہے نہ مستقبل، نہ کوئی ذوق ہوتا ہے نہ کوئی معیار اور نہ ان سے کسی خیر کی امید، اس کے دو ہی سبب بظاہر سمجھ میں آتے ہیں یا تو فن تربیت سے عدم واقفیت یا پھر بچوں کو وقت نہ دینا، مقدرات تو کوئی نہیں جانتا البتہ حرام مال سے تربیت کے اثرات بھی اچھے مرتب نہیں ہوتے۔

اولاد کی صحیح تربیت کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اپنے آپ کی اصلاح کی جائے اور بہتر ہے کہ اپنے آپ کو بچہ کے سامنے آئیڈیل بنا کر پیش کیا جائے، اس لئے کہ یہ تجربہ کی بات ہے کہ بچہ اپنے گھر کے بڑوں بالخصوص اپنے والدین کی زبردست تقلید کرتا ہے، اور ان کا خوب اثر قبول کرتا ہے، اس سلسلہ میں خود بھی اسلاف کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے اور بچوں کو بھی ان کی زندگیاں قصوں کے اسلوب میں پڑھائی جائیں۔

بنیادی طور پر یہ کوشش ہونی چاہئے کہ حرام مال گھر میں آنے ہی نہ پائے، اور خدانخواستہ اگر اس میں کچھ تساھل ہوجاتا ہے یا مشکوک مال آجاتا ہے تو بچے کی تعلیم وتربیت میں اس کو قطعی نہ استعمال کیا جائے۔

بچپن کی خصوصیات سے تقریباً ہر عام وخاص کو واقفیت ہوتی ہے لیکن ان کو برتنے میں کوتاہی ہوتی ہے، مثلاً بچے میں صحیح وغلط میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، ایک بری چیز اس کو اچھی لگ سکتی ہے اور ایک بھلی بات اس کے لئے نامانوس بن جاتی ہے، اب والدین کے کردار کے مطابق اس میں اچھے اور برے کی تمیز پیدا ہوگی، شدت تقلید بچپن کی ایک اہم خصوصیت ہے لیکن والدین اس کی رعایت نہیں کر پاتے، اٹھکھیلیاں کرنا، مچلنا اور کبھی ایک حالت پر باقی نہ رہنا بچپن کی خصوصیات میں ہے لیکن اس میں نفع ونقصان والدین کے انداز تربیت کا متقاضی ہے، اسی طرح اور بہت سی بچپن کی خصوصیات ہیں جن کا اندازہ کرنا اور معتدل راستہ نکالنا انتہائی ضروری ہوتا ہے ورنہ بچہ بہر حال کسی نہ کسی ظاہری یا معنوی نقصان کا شکار ہوجاتا ہے، والدین کی محبت میں افراط وتفریط اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے، بچہ میں ایک خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ تشجیع یعنی حوصلہ افزائی کا طالب ہوتا ہے، اب اگر بہت زیادہ تشجیع کی گئی تو ممکن ہے کہ وہ بے جا خود اعتمادی

(OVER CONFIDENCE) کا شکار ہو جائے، اور اگر ہمیشہ اس کے حوصلے پست کئے گئے تو خوف ہے کہ وہ احساس کمتری (INFERIORITY COMPLEX) کا شکار ہو جائے۔

اسی طرح بچوں کی ضروریات کے خیال رکھنے کا مسئلہ ہے، اول تو جائز و ناجائز کی تفریق کا خیال رکھنا اور اس کا فرق سمجھانا ضروری ہے، پھر ان کی ضروریات کی برآری میں کفایت کا درس دینا، ان کو احساس کمتری سے بچانا اور ساتھ ہی اپنی استطاعت کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے، یہ خیال رکھنا والدین کے لئے عام طور سے بہت مشکل ہوتا ہے کہ بچے کی ضروریات اس کی خواہشات نہ بننے پائیں، اس میں وجہ ترجیح کو تلاش کر ضروریات پوری کرنا اور خواہشات سے بچانا بڑے کمال کی بات ہے، ورنہ بسا اوقات مستقبل میں یہ چیز نہ صرف والدین کے لئے مصیبت کا سبب بلکہ بچے کو اس کی جوانی میں پریشانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔

بچہ کی تعلیم و تربیت میں اس کے ذوق و نفسیات کا اندازہ کرنا انتہائی ضروری ہے، تعلیم کا آغاز تو بہر حال قرآن سے کرنا ہے لیکن قرآن و عقائد کی تعلیم کے علاوہ بہر صورت اپنی خواہش سے زیادہ بچہ کی نفسیات کا خیال رکھ کر تعلیم کا انتظام کرنا چاہئے، اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ ایک مسلم شخصیت کی شکل میں تیار ہو، مسلم بچہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صحیح العقیدہ ہو، عبادات کے صحیح طریقوں سے واقف ہو، اخلاقیات کی تعلیم سے آراستہ ہو، اس کا فکر بہت مرتب ہو، جسم مضبوط ہو، دوسروں کی نفع رسانی کا خیال کرتا ہو، اپنے وقت کا لحاظ رکھتا ہو، مجاہدے کی عادت ہو، کمانے پر قدرت رکھتا ہو، اپنے معاملات کو منظم رکھنے کا عادی ہو، ان میں سے ہر خصوصیت کو پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں ہدایات حاصل کی جائیں اور مناسب موجود وسائل کے ذریعہ یہ خصوصیات پیدا کی جائیں، اسی لئے یہ بھی ضروری ہے کہ بچہ کو اپنی سرپرستی میں سیر و تفریح اور کھیل کود کے مناسب مواقع فراہم کیے جائیں، ضیاع وقت سے بچتے ہوئے ان کی ذہنی تفریح اور جسمانی کھیل کا ضرور انتظام کیا جائے۔

اچھی غذائیت جو ممکن ہو سکے ضرور دی جائے، طبی معائنہ وقتاً فوقتاً ضرور کرایا جائے، ان سب چیزوں کے ساتھ نہایت ضروری ہے کہ اس کو نفسیاتی بیماریوں سے بچایا جائے، مثلاً اس میں کسی طرح کا احساس کمتری نہ پیدا ہو، وہ تعلی کا شکار نہ ہونے پائے، عصبیت کا فاسد مادہ اس میں جنم نہ لینے پائے، بے جا خوف، بے ضرورت شرمندگی، جھجک، لاپرواہی و سرکشی جیسی نقصان دہ عادتوں سے بچہ کو بچانا انتہائی ضروری ہے۔

بچہ کی تربیت کے بہت سے انداز ہیں، ان میں ایک تجربہ کی بات یہ ہے کہ عام طور پر وہ بچے بہت کامیاب نہیں ہو پاتے جن کی تربیت میں ماں کی بے جا محبت اور باپ کا بے جا عتاب کارفرما ہوتا ہے، بچہ کا زیادہ وقت ماں کے ساتھ گزرتا ہے اس لئے اس کا سخت ہونا ضروری ہے، اور باپ کی آراء اولاد کے لئے عام طور پر بڑی سوجھ بوجھ

اور نافعیت پر مبنی ہوتی ہیں، اس لئے اس کا نرم ہونا ضروری ہے تا کہ اس کے غضب سے وہ ماں کی محبت میں پڑ کر اپنا مستقبل خراب نہ کرے اور باپ کا یہ بے جا غضب اس کے لئے حجاب نہ بن جائے، جس سے وہ اپنی ہر خامی چھپائے اور ناکامی کے اسباب جمع کر کے اپنا مستقبل خراب کر بیٹھے۔

اچھی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ محبت وسزا میں توازن واعتدال کو برتا جائے، محبت کو ظاہر کرنے والے مظاہر و وسائل کا بھرپور استعمال کیا جائے بچہ کو اس کی عقل کے مطابق مخاطب کیا جائے اور اسی قدر مکلّف بنایا جائے، محبوب ترین الفاظ سے اس کو مخاطب کیا جائے، اس کو مؤثر قصے کہانی فراہم کئے جائیں جن سے اخلاقی تربیت اور اولوالعزمی کا درس ملے، عفو ودرگذر کا معاملہ کرنے کے ساتھ دوسروں کے سامنے اپنے بچوں کی تعریف کی جائے، اس کو بوسہ لیا جائے، اچھی طرح بچے کا استقبال کیا جائے، محبت کے ساتھ اس کو چمٹایا جائے، کبھی کبھی ہدایا وتحائف اور انعامات سے نوازا جائے، اس کے سوالات کی قدر کی جائے، اس کے معیار عقل کے پیش نظر اس کو جوابات دیئے جائیں، تشویق وحوصلہ افزائی کی باتیں کی جائیں، ان کے علاوہ اس طرح کے اور بہت سے وسائل کا استعمال کیا جاسکتا ہے جس میں بغیر کسی صرفہ وتکلیف کے اس بات کا اظہار ہو کہ اس پر والدین کا ایثار و محبت، شیفتگی وفریفتگی وا ہو جائے، لیکن محبت وعقاب میں توازن برقرار رکھنے کے لئے (اور اچھی تربیت کے لئے یہی لازمی ہے) ضروری ہوگا کہ کبھی کبھی کوئی سزا دی جائے، اس میں عام طور پر ہمارے معاشرے میں افراط وتفریط ہے، یا تو بچہ کی ہر خوشی کا خیال رکھا جاتا ہے، یا تو ادنیٰ سی بات پر اس کو سخت پریشانیوں اور سزاؤں میں مبتلا کیا جاتا ہے، حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہئے کہ بچہ صرف نگاہوں کی تلخی بلکہ نظر اٹھانے سے سہم جائے اور اپنی حرکت سے باز آجائے، یا پھر تنبیہ کے لئے اسکو کسی خاص جملہ و آواز کا عادی بنایا جائے، یا اسی طرح سزا کے لیے اس کے سامنے دوسروں کی تعریف کی جائے، اس سے صرف نظر کیا جائے، بعض چیزوں کو نہ دے کر اس کو سزا کا احساس دلایا جائے، ایک آدھ روز اس سے بات چیت بند کر کے ناراضگی ظاہر کی جائے لیکن یہ تین روز سے زیادہ نہ ہو اور بچہ کے اعتراف خطا کے ساتھ ہی یہ معاملہ ختم کر دیا جائے، کبھی ڈرایا اور دھمکایا جائے، گوشمالی یا ہلکی پھلکی پٹائی کر دی جائے لیکن یہ سمجھ کر کہ یہ سزا کا آخری وسیلہ ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ وار بھی خالی جائے۔

یوں بھی اردو میں اس موضوع پر بہت کم مواد ہے، جو کچھ ہے وہ بہت مفصل یا بہت مختصر ہے، البتہ عربی میں اس موضوع پر بڑی قیمتی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، محمد سعید مرسی کی "فن تربیة الاولاد فی الاسلام" شیخ احمد خلیل جمعہ کی "الطفل فی ضوء القرآن والسنة والأدب" شیخ عبداللہ علوان کی "تربیة الاولاد فی الاسلام" محمد نور عبدالحفیظ سوید کی "منهج التربیة النبویة للطفل" خاص اہمیت کی حامل ہیں، شیخ احمد خلیل جمعہ کی کتاب کا اردو ترجمہ بھی راقم کی نظر سے گذرا ہے۔ ☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

گوشۂ سیرت

قرآن کریم کی امتیازی صفات

تحریر: مسٹر اڈیار
مترجم: ایم، اے جمیل احمد

مذہبی کتابیں مختلف نوعیت کی پائی جاتی ہیں، ان میں ہر ایک کی جداگانہ خصوصیت ہے۔

ہندو مذہب کی سب سے مقدس کتاب وید ہیں، وید منیوں اور رشیوں کے خدا کے شان میں گائے گیتوں کا مجموعہ ہیں۔

عیسائیوں کی انجیلیں اور یہودیوں کی تورات کے اجزاء درحقیقت انسانوں کے ہاتھوں لکھی ہوئی انبیاء کی تاریخ اور سوانح ہیں۔

اسی طرح جتنی مذہبی کتابیں نظر آتی ہیں، وہ یا تو بعض بزرگ شخصیتوں کے خدا کی شان میں گائے ہوئے گیت ہیں، یا انسانوں کا لکھا ہوا نبیوں اور بزرگوں کے حالات کا مجموعہ ہیں۔

اس کے برعکس قرآن مجید کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں لکھی ہوئی کتاب نہیں ہے، اور نہ یہ خدا کے شان میں گائے انسانوں کے گیتوں کا کوئی مجموعہ ہی ہے، اس کی حیثیت محض کسی تاریخ کی بھی نہیں ہے، بلکہ:

☆ اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں جو قابل تکریم کتاب رکھی ہے، وہی قرآن کریم ہے

☆ لوح محفوظ کی اس کتاب سے جلیل القدر فرشتے حضرت جبرئیلؑ نے اس کو وقتاً فوقتاً نبی کریم ﷺ پر اللہ کی طرف سے پہنچایا۔

یہی مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ قرآن کریم لکھی ہوئی کتاب نہیں ہے بلکہ نازل کردہ کتاب ہے۔ مسلمان اس پر غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں۔

اس کتاب کی بہت سی امتیازی صفات ہیں، اس کے الفاظ کے صوتی آہنگ سے میں مسرور ہوا ہوں، کیا آواز کو کسی قسم کا تقدس حاصل ہے؟ میں کہوں گا کہ ہاں ہے،

آواز ھی دنیا کی بنیاد ھے۔

وید کہتا ہے کہ ''اوم'' کی آواز سے دنیا کی تخلیق ہوئی۔

بائبل کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے خدا کا کلمہ، پھر یہ دنیا ہوئی۔

قرآن کریم کی آواز جہاں ایک بہترین نثر کی آواز

ہے، وہیں وہ اپنے اندر ایک بہترین شعر کا آہنگ لیے ہوئے ہے، ایک بہترین منظر کا حسن بھی اس میں پایا جاتا ہے، نثر اور نظم وشعر کی نغماتی کائنات کا حسن، انہیں چیزوں کا مجموعہ ہے، قرآن کریم کی آواز۔

کیا یہ کلام اتنا حسین ہے کہ اس کے مثل کوئی کلام ممکن نہیں؟ یہ سوال آج بھی کیا جاسکتا ہے اور اس دور میں بھی اٹھایا گیا تھا جبکہ قرآن نازل ہورہا تھا، قرآن نے اس سوال کا جواب اسی وقت دے دیا تھا کہ اگر ہوسکے تو اس جیسا کلام لے آؤ۔

اس چیلنج کا جواب دینے سے دنیا آج تک قاصر ہے، اس کی کوشش جس نے بھی کی اس نے منہ کی کھائی۔

قرآن کہتا ہے: اے نبی ہم نے تمہیں کوثر عطا کردیا، بس تم اپنے رب ہی کے لئے نماز پڑھو، قربانی کرو، تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے (۱۰۸:۱-۳)

اس طرح حسن وحکمت سے لبریز اس کتاب کی آیات ہیں، اس کے مقابلے میں ماہر عربی شعراء نے اسی دور میں کوشش کی، اور اپنی شکست فاش کا اعتراف ان الفاظ میں کیا: 'ما هذا كلام البشر' یہ انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔

قرآن نے چیلنج کیا، کہہ دو کہ انسان اور جن سب کے سب مل کر قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ہی کیوں نہ کریں۔ (۱۷:۸۸)

قرآن مجید ہی میں اس کے درج ذیل نام ہم کو ملتے ہیں، یہ سب نام اہمیت کے حامل ہیں، اور بڑی حقیقتوں کے مظہر ہیں:

الكتاب	کتاب
حبل الله	اللہ کی رسی
البيان	کھول کھول کر بیان کرنے والی
البرهان	واضح دلیل
المهيمن	حفاظت کرنے والی
المبارك	برکت والی
المصدق	تصدیق کرنے والی
الذكرى	نصیحت کرنے والی
النور	روشنی
البصائر	بصیرت عطا کرنے والی
الهدى	سیدھی راہ دکھانے والی
الرحمة	رحمت
الشفاء	شفا دینے والی
الموعظة	نصیحت کرنے والی
الحكم	حکم کرنے والی، حکم دینے والی
المبين	واضح، صاف صاف
العربى	عربی زبان میں
الحكمة	عقل ودانش سے بھری ہوئی
الحق	سچی

القیم	مضبوط
الفرقان	(حق و باطل میں) فرق کرنے والی
التنزیل	اترنے والی (اتاری ہوئی)
الحکیم	حکمت والی
الذکر	یاددہانی کرنے والی
البشیر	بشارت دینے والی
النذیر	ڈرانے والی
العزیز	طاقت والی
الروح	روح والی، جاندار
المجید	عزت والی
الکریم	بزرگ
المکرمة	احترام والی
العجیب	عجائب سے بھری ہوئی
المرفوعة	بلند، اٹھائی ہوئی
المطهرة	پاکیزہ، پاکی والی
النعمة	نعمت

اس کے علاوہ قرآن کے معنی ہیں پڑھی جانے والی، ہاں یہی کتاب پڑھی جانے والی کتاب ہے، دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب۔

☆☆☆

قطعات

اترا ہوا ہے چہرہ میاں خیریت تو ہے
کچھ تو ہمیں بتاؤ اماں خیریت تو ہے
یہ رات یہ اندھیرا یہ بادل یہ گھن گرج
ایسے میں جا رہے ہو کہاں خیریت تو ہے

❑❑❑

سوچ سکتے ہیں کہہ نہیں سکتے
آپ کی رو میں بہہ نہیں سکتے
آپ باظرف ہیں کریں برداشت
ہم مگر ظلم سہہ نہیں سکتے

❑❑❑

ابھی نہ چھیڑو مگر نہ خراب کر دوں گا
تری حیات کے ہر پل کو خواب کر دوں گا
یہ کوئی وقت ہے ساقی ترے تقاضے کا
سحر تو ہونے دے ظالم حساب کر دوں گا

❑❑❑

○ گوشۂ سیرت

کوئی آیا نہ مگر رحمتِ عالم بن کر

مولانا محمد سراج الہدیٰ ندوی ازہری
استاذ دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

اللہ تعالیٰ نے اس عالم آب گیتی میں انسانوں کی رہنمائی کے لیے بہت سارے انبیاء ورسل بھیجے، جن کا سلسلہ سیدنا آدمؑ سے شروع ہوکر خاتم الانبیاء والمرسلین سیدنا محمد ﷺ پر ختم ہوتا ہے، تمام انبیاء ورسل معزز ومحترم تھے اور سبھوں پر ایمان لانا بھی واجب ہے، ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرنا آدمی کو اسلام کے دائرہ سے خارج کردے گا اور اس کا شمار مسلمانوں میں نہیں ہوسکے گا، تاہم آخری نبی ﷺ کی جو حیثیت ہے وہ انگوٹھی میں نگینہ اور تاج میں ہیرے کے مانند ہے، آپ ﷺ کے بغیر نبوت کی عمارت نامکمل ہے، آپ ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے کو مکمل فرمایا ہے، خود ہمارے آقا ﷺ کا ارشاد ہے: ''میری اور مجھ سے پہلے آنے والے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص مکان بنائے، اس کی تعمیر نہایت خوبصورتی سے کرے اور اسے خوب سجائے؛ لیکن ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دے، پھر لوگ اس کا چکر لگائیں اور اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر حیران ہوں، ساتھ ہی وہ یہ بھی کہیں کہ یہ اینٹ کیوں نہیں لگائی گئی، تو میں دراصل وہ آخری اینٹ ہوں اور اسی لحاظ سے خاتم النبیین ہوں''۔ (البخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین: ۳۵۳۵، مسلم، کتاب الفضائل، باب ذکر کونہ ﷺ خاتم النبیین: ۲۲۸۶)

نبی کے رحیم ہونے پر قرآن کریم کی گواہی

مختلف انبیاء مختلف القاب وخطابات سے نوازے گئے، حضرت آدمؑ کو ''صفی اللہ'' کہا گیا تو حضرت نوحؑ ''نجی اللہ'' سے مشہور ہوئے، حضرت ابراہیمؑ کو ''خلیل اللہ'' کہا گیا تو حضرت اسماعیلؑ ''ذبیح اللہ'' سے مشہور ہوئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ''کلیم اللہ'' کہا گیا تو حضرت داؤدؑ ''خلیفۃ اللہ'' اور حضرت عیسیٰؑ ''روح اللہ'' سے جانے گئے؛ لیکن ان سب سے بڑھ کر، ان سب سے اعلیٰ، ان سب سے جدا اور ان سب سے جامع لقب ہمارے آخری نبی سیدنا محمد ﷺ کو دیا گیا، جو ابدی ٹھہرا اور وہ ہے ''رحمۃ للعالمین'' کا لقب، آپ ﷺ کا یہ لقب کسی خاص علاقہ، خاص زمانہ اور خاص طبقہ کے لیے نہیں ہے، بلکہ آپ ساری دنیا کے لیے ''رحمت'' بنا کر بھیجے

گئے ''وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ ''سچ کہا ہے کسی شاعر نے :

آئے دنیا میں بہت پاک ومکرم بن کر
کوئی آیا نہ مگر رحمت عالم بن کر

نبیٔ رحمت، رحمت عالم

آپ ﷺ سارے عالم کے لیے رحمت تھے اور ابھی بھی ہیں، بایں معنی کہ آپ کی تعلیمات قیامت تک سبھوں کو رحمت کا پیغام دیتی رہیں گی۔آں حضرت ﷺ نے اپنی ''شانِ رحمت'' کے بارے میں خود ارشاد فرمایا ہے : میں وہ رحمت ہوں، جسے اللہ نے اپنی مخلوق کو بطور تحفہ عطا فرمایا ہے۔(سنن دارمی ۱/۲۱، حدیث نمبر:۱۵) ایک مرتبہ اہلِ کفر کے لیے جب بد دعا کرنے کی التجا کی گئی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں لعنت کرنے کے لیے نبی نہیں بنایا گیا، مجھے تو خدا کی طرف بلانے والا اور سراپا رحمت بنایا گیا ہے۔

(مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب النہی عن لعن الدواب وغیرھا، حدیث نمبر:۲۵۹۹)

آیئے! ہم آپ کو مخلوق کے مختلف طبقات کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی محبت وشفقت، رحمت ومودت، ہمدردی و غمگساری، ملنساری وغمخواری اور رواداری و دلداری کی اک اک جھلک دکھلاتے اور بتلاتے چلیں، جن سے تفسیر وحدیث اور سیر وتاریخ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور جو ہمارے نبی رحمت کے ''رحمۃ للعالمین'' ہونے کا واضح ثبوت ہیں۔

تمام مخلوق کے ساتھ آپ ﷺ کی رحمت

آپ تمام جہانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور آپ کی تعلیمات ہی میں تمام لوگوں کی کامیابی و کامرانی کا راز مضمر ہے۔آپ ساری مخلوق کے خیر خواہ تھے اور آپ کے فرامین وفرمودات میں سبھوں کے لیے رحمت و شفقت کا پیغام ہے، خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔آپ ﷺ نے فرمایا: رحم کرنے والوں پر رحمٰن کی رحمت ہوتی ہے، اگر تم اہلِ زمین پر رحم کرو گے تو وہ جو آسمان پر ہے تم پر رحمت نازل کرے گا (ابوداؤد، باب فی الرحمۃ، حدیث نمبر:۴۹۴۱) اس حدیث میں روئے زمین پر بسنے والی تمام مخلوق کی طرف رحم کرنے کی واضح بات موجود ہے، یہ الگ بات ہے کہ مخلوق کی نوعیت کے لحاظ سے رحمت کا انداز مختلف ہوگا، مشہور شاعر مولانا الطاف حسین حالیؔ نے اس حدیث کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

صحیحین کی روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ اس پر رحم نہیں کرتا (متفق علیہ، بخاری کتاب الادب، باب رحمۃ الناس والبہائم) رحم وکرم کے باب میں یہاں مسلم وغیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں کی گئی، بلکہ عام پیغام سنایا گیا۔ایک دوسری روایت میں ہے : جو رحم نہیں کرتا ہے اس پر رحم نہیں کیا جاتا ہے۔(متفق علیہ) رحم وکرم کی یہ عمومیت معاملات، معاشرت اور رہن سہن سب پر محیط ہے۔

مومنوں کے ساتھ آپ ﷺ کی رحمت

آپ نے مومنوں (مسلمانوں) کے ساتھ بھی

عبادات سے لے کر معاملات تک ہر کام میں رحمت کا پہلو اختیار کیا ہے، بلکہ ہمیشہ اسی کو ترجیح دی ہے، جیسا کہ حج کی فرضیت کا جب آپ ﷺ نے اعلان کیا، تو ایک صحابیؓ نے دریافت کیا ''أَكُلَّ عَامٍ؟ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!'' کیا ہر سال حج کرنا فرض ہے؟ اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ خاموش رہے یہاں تک کہ یہی سوال انھوں نے تین بار کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَمَا اسْتَطَعْتُمْ ''اگر میں ہاں کہہ دیتا، تو یقیناً ہر سال واجب ہو جاتا اور تم اس کی طاقت نہ رکھتے۔ (مسلم، کتاب الحج، باب فرض الحج مرۃ فی العمر) مومنوں کے ساتھ رحم وکرم کا پہلو اختیار کرتے ہوئے ہمارے نبی ﷺ نے حج کی فرضیت کو ہر سال واجب ہونے سے بچالیا۔ اسی طرح مسواک کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: اگر مجھے اپنی امت کے مشقت میں پڑ جانے کا خوف نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔ (متفق علیہ) کسی چیز کی فرضیت تو اللہ کے حکم سے ہوتی ہے؛ لیکن یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کو اس میں اختیار دیا گیا تھا اور آپ ﷺ نے اسے واجب نہیں کیا، تاکہ میری امت مشقت سے بچ جائے۔

نماز جیسی عظیم عبادت میں بھی پیارے نبی ﷺ نے کمزوروں، بیماروں اور بوڑھوں کی رعایت کرنے کا حکم دیا ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے: جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کو نماز پڑھائے، تو اسے چاہیے کہ ہلکی نماز پڑھائے، اس لیے کہ ان میں کمزور، بیمار اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں۔ (متفق علیہ) ایک جگہ آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا کہ: میں نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ طویل نماز پڑھوں کہ کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو اس خیال سے نماز مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں کو دشواری اور تکلیف نہ ہو۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب من اخف الصلوٰۃ) آپ ﷺ نے بے جا تکلفات، جائز حقوق سے روگردانی اور رحمت وآسانی کے پہلو کو چھوڑ دینے پر ناگواری کا اظہار کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: دین آسان ہے اور جو بھی دین سے زور آزمائی کرے گا، دین اس پر غالب آئے گا، اس لیے میانہ روی اور اعتدال کے ساتھ چلو، قریب کے پہلوؤں کی رعایت کرو اور انبساط رکھو اور صبح وشام اور کسی قدر تاریکی شب کی عبادت سے تقویت حاصل کرو۔ (بخاری، کتاب الایمان، باب: الدین یسر) یہ ہے مومنوں اور اپنے پیروکاروں کے ساتھ نبی ﷺ کی رحمت وکرم گستری کی ایک بولتی ہوئی تصویر۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے پوچھا کہ: میں نے سنا ہے کہ تم راتوں کو برابر جاگتے اور دن کو برابر روزہ رکھا کرتے ہو؟ عبداللہؓ نے کہا: ہاں! فرمایا: ''فلا تفعل، صم و افطر، قم و نم، فان لجسدک علیک حقاً و ان لعینک علیک حقاً و ان لزوجک علیک حقاً. ''اب ایسا نہ کرو، روزہ بھی رکھو اور کچھ وقت کے لیے چھوڑ بھی دو، رات کو عبادت کے لیے جاگو بھی اور سوؤ بھی، دیکھو تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔ (بخاری، کتاب النکاح) ذرا سوچئے اور بولیئے کہ اتنی نرمی ومحبت کس کی تعلیم میں مل سکتی ہے؟

عورتوں کے ساتھ آپ ﷺ کی رحمت

عورتوں کے بارے میں بھی آپ ﷺ نے حسن سلوک، رحم وکرم، شفقت ومہربانی اوران کا مناسب خیال رکھنے کا حکم دیا ہے ، خواہ عورتیں ماں ہوں، بہنیں ہوں، بیویاں ہوں، بیٹیاں ہوں یا کسی اور درجے میں ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو؛ اس لیے کہ عورت کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے اور پسلی میں سب سے زیادہ ٹیڑھا حصہ، اس کا اوپر کا حصہ ہے، اگر تم اسے سیدھا کرنے لگو گے تو اسے توڑ بیٹھو گے اور اگر اسے چھوڑ دو گے تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی، پس تم عورتوں کا خیال رکھو۔ (متفق علیہ) اس جیسی بہت ساری احادیث ہیں، جو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دیتی ہیں، سنن ابی داؤد کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ''لَا تَضْرِبُوْا اِمَاءَ اللّٰہِ. ''اللہ کی باندیوں کو مت مارو، پھر حضرت عمرؓ نے اللہ کے رسول سے فرمایا: عورتیں اپنا خاوندوں پر دلیر ہوگئی ہیں، تو آپ ﷺ نے مارنے کی رخصت دی، پھر عورتوں نے اپنے خاوندوں کی شکایت کیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: محمد کے گھر والوں کے پاس بہت سی عورتوں نے ہجوم کیا ہے، جو اپنے خاوندوں کی شکایت کرتی ہیں، یاد رکھو! ایسا کرنے والے لوگ تم میں بہتر نہیں ہیں۔ (ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی ضرب النساء) شوہر پر بیوی کے حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے کہا: جب تو کھائے، تو اسے کھلا، جب تو لباس پہنے، تو اسے بھی پہنا اور اس کے چہرے پر مت مار، نہ اسے بُرا بھلا کہہ اور علیحدگی اختیار کرنی ہو، تو گھر کے اندر ہی کر۔ (ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی حق المرأۃ علی زوجہا) یاد رکھیے! عورت زندگی کی رفیق ہے فریق نہیں؛ اس لیے ہمیشہ رحمت کا پہلو اختیار کیجیے!

اہلِ خانہ کے ساتھ آپ ﷺ کی رحمت

انسان کی اصل حقیقت اس کے گھر والوں ہی سے معلوم ہوتی ہے، ہمارے نبی ﷺ جس طرح غیروں کے لیے رحم دل تھے، اسی طرح اپنے گھر والوں کے لیے بھی تھے۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں: میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا، جو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اپنے اہل وعیال پر شفیق ورحیم ہو۔ (مسند احمد بروایت انس، ومسلم) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سب سے زیادہ بہتر وہ ہے، جو اپنے اہل وعیال کے لیے سب سے بہتر ہو اور میں اپنے اہل وعیال کے معاملہ میں تم سب سے زیادہ بہتر ہوں۔ (ابن ماجہ، باب حسن معاشرۃ النساء) حضرت عائشہؓ ایک دوسری جگہ فرماتی ہیں کہ: آپ ﷺ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ نرم اور سب سے زیادہ کریم تھے اور ہنستے مسکراتے رہتے تھے۔ (تاریخ دمشق از ابن عساکر، باب صفۃ خلقہ ومعرفۃ خلقہ: ۳۸۳/۳)

والدین اور اولاد کے ساتھ آپ ﷺ کی رحمت

آپ ﷺ تو یتیم پیدا ہوئے تھے اور والدہ کا انتقال بھی کم عمری ہی میں ہوگیا تھا؛ لیکن والدین کی عظمت، ان کے ساتھ ادب واحترام سے پیش آنا، ان کی عزت وتعظیم کرنا اسلام کی اہم تعلیمات ہیں۔ قرآن کریم نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بار بار تاکید کی ہے اور بہت اہمیت کے

ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، یہاں پر ہم والدین کے متعلق احادیث نبویہ سے چند باتیں پیش کرتے ہیں۔

آپ ﷺ نے والدین کے ساتھ رحم وکرم کی تعلیم دی ہے، بلکہ انھیں اولاد کے جنت و دوزخ میں جانے کا سبب بتایا ہے، حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ سے پوچھا: حضرت! اولاد پر ماں باپ کا کتنا حق ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ تمہاری جنت اور دوزخ ہیں۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، حدیث نمبر: ۳۶۶۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ان کی اطاعت و فرمانبرداری کی، ان کی بات مانی اور ان کی خدمت کی، تو وہ تمہارے جنت میں جانے کا سبب بنیں گے اور اگر تو نے ان کی نافرمانی کی اور ان کی بات نہ مانی، تو اس کی وجہ سے تو جہنم میں جائے گا۔ ایک دفعہ حسنِ سلوک کا حکم دیتے ہوئے آپ ﷺ نے تین مرتبہ ماں کا تذکرہ کیا اور چوتھی دفعہ باپ کا تذکرہ کیا۔ (متفق علیہ، بخاری، کتاب الادب، باب من احق الناس.....) والدین کی خدمت کرنا، انھیں اُف تک نہ کہنا، جنت کی راہ کو ہموار کرتا ہے۔ والدین یا ان میں سے کوئی ایک اگر کافر ومشرک ہوں، تو ان کے ساتھ بھی حسنِ سلوک اور رحمت کا معاملہ کرنا چاہیے، حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ کہتی ہیں کہ میری ماں جب کہ وہ مشرکہ تھیں، میرے پاس آئیں اور یہ رسول اللہ ﷺ اور مشرکین مکہ کے درمیان صلح (حدیبیہ) کا زمانہ تھا میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میری والدہ میرے پاس آئی ہیں اور مجھ سے حسن سلوک کی خواہش مند ہیں، کیا میں اپنی والدہ سے صلہ رحمی (حسن سلوک) کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! تم اپنی والدہ سے صلہ رحمی کرو۔ (متفق علیہ، بخاری، کتاب الہبہ، باب الہدیۃ للمشرکین)

والدین کے انتقال کے بعد ان کے لیے دعائیں کرنا، استغفار کرنا، ان کے وعدوں کو پورا کرنا، ان کے ساتھ نیکی اور رحمت سے پیش آنا، ان کے لیے ذخیرۂ آخرت کا ذریعہ ہے۔ بنوسلمہ کے ایک آدمی نے اللہ کے رسول ﷺ سے پوچھا: کیا میرے والدین کے انتقال کے بعد نیکی کی کوئی راہ ہے؟ جو میں ان کے لیے کروں، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! ان دونوں کے لیے دعائیں کرنا، ان کے لیے استغفار کرنا، ان دونوں کے وعدوں کو پورا کرنا، ان کے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا، جو اُن ہی دونوں کے ذریعہ ہوسکتی تھی اور ان دونوں کے دوستوں کی تعظیم کرنا۔ (ابوداؤد) یہ تو والدین کے ساتھ رحمت سے پیش آنے کی چند باتیں تھیں، اب اولاد کے ساتھ رحم وکرم کی چند تعلیمات بھی ملاحظہ کیجیے!

اولاد کی اچھی تربیت کرنا اور انھیں تہذیب وثقافت سے آشنا کرنا، والدین کی بنیادی ذمہ داریوں میں ہے اور یہ اولاد کے ساتھ رحم وکرم کرنے کے مترادف ہے۔ یوں تو لڑکیوں کی پرورش وپرداخت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی بہت فضیلتیں آئی ہیں؛ لیکن یہاں صرف لڑکیوں کا ذکر نہیں، بلکہ مطلق اولاد کا ذکر مقصود ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: آدمی کا اپنی اولاد کو مؤدب بنانا، ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔ (ترمذی، باب ماجاء فی ادب الولد، حدیث نمبر: ۱۹۵۱، امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث غریب

ہے۔) آپ ﷺ نے ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ: کسی والد کا اپنی اولاد کو عمدہ ادب سکھانے سے بہتر کوئی چیز دینا نہیں ہے۔ (ترمذی، باب ماجاء فی ادب الولد، حدیث نمبر: ۱۹۵۲، امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث میرے نزدیک مرسل ہے۔)

بچوں کے ساتھ آپ ﷺ کی رحمت

آپ ﷺ بچوں پر بھی بہت شفیق تھے اور ان سے بہت نرمی ومحبت کا معاملہ فرماتے تھے، سچ تو یہ ہے کہ آپ محبت ورحمت اور لطف وعنایت کے پیکر تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے فرماتے: میرے دونوں بیٹوں (حسن و حسین) کو بلاؤ، وہ دوڑے ہوئے آتے، تو آپ ﷺ ان دونوں سے منہ ملاتے اور ان کو اپنے سینے سے لگا لیتے۔ (ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب الحسن والحسین) ایک مرتبہ کچھ اعرابی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور پوچھا کہ: کیا آپ لوگ اپنے بچوں کو پیار کرتے ہیں؟ ہم تو ان کو پیار نہیں کرتے، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر اللہ نے تمہارے دل سے رحم نکال لیا ہو، تو میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ (بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الولد) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے حضرت حسن بن علیؓ کا بوسہ لیا، آپ ﷺ کے پاس اقرع بن حابس بیٹھے ہوئے تھے، اقرعؓ نے کہا: میرے دس بچے ہیں، میں نے ان میں سے کسی کو بوسہ نہیں دیا، رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: جو کسی پر رحم نہیں کرتا، اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔ (متفق علیہ) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بچوں کو پیار وشفقت سے چومنا، انھیں بوسہ دینا، نہ صرف جائز بلکہ رحمت الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ایک صحابیؓ کا بیان ہے کہ: میں بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا، لوگ مجھ کو خدمت اقدس میں لے گئے، آپ ﷺ نے پوچھا: ڈھیلے کیوں چلاتے ہو؟ میں نے کہا: کھجوروں کے لیے، ارشاد فرمایا: زمین پر ٹپکی ہوئی کھجوریں کھالیا کرو، ڈھیلے نہ مارو، یہ کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔ (سیرۃ النبی از علامہ شبلی نعمانیؒ: ۱۷۸/۲، بحوالہ ابوداؤد، کتاب الجہاد) ذرا سوچیے اور بتائیے کہ بچوں کے ساتھ اتنی شفقت ورحمت کہاں مل سکتی ہے؟

پڑوسیوں کے ساتھ آپ ﷺ کی رحمت

آپ ﷺ نے پڑوسیوں کا پورا خیال رکھا اور اس کی مکمل تعلیم دی کہ ان کے ساتھ پیار ومحبت اور شفقت ومہربانی سے پیش آیا جائے، انھیں اپنی شرارتوں سے محفوظ رکھا جائے۔ آپ ﷺ نے تین بار فرمایا: اللہ کی قسم وہ مومن نہیں، عرض کیا گیا: کون اے اللہ کے رسول؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔ (متفق علیہ) کھانے پینے میں بھی آپ ﷺ نے پڑوسیوں کا خیال رکھنے کا حکم دیا جو رحم وکرم ہی کا ایک پہلو ہے۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! جب تم شوربے (والا سالن) پکاؤ، تو اس میں پانی زیادہ کرلو اور اپنے پڑوسی کا خیال رکھو۔ (مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب الوصیۃ بالجار.....) یہ ہمارے نبیؐ رحمت ہی ہے جو

اپنے ساتھ پڑوسیوں کا بھی پورا خیال رکھ رہی ہے، ورنہ اس دنیا میں ہر انسان اپنی ہی فکر میں بوڑھا ہوتا جارہا ہے، نبی کی تعلیمات میں پڑوسیوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے، پڑوسی خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم سبھوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور رحم و کرم کا معاملہ کرنا اسلام کی تعلیم ہے۔ اسلام کو بُرا کہنے والو! ذرا اسلام کی ان تعلیمات کو تو دیکھو۔

غلاموں اور خادموں کے ساتھ آپ ﷺ کی رحمت

آپ ﷺ نے غلاموں، خادموں اور ماتحتوں کے ساتھ بھی رحم و کرم کا حکم دیا ہے اور دنیا کے سامنے عملی نمونہ بھی پیش کیا ہے، جس کی مثال دنیائے انسانی دینے سے قاصر ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: میں نے نبی کریم ﷺ کی دس سال خدمت کی، آپ نے کبھی ہوں بھی نہیں کہا اور نہ یہ فرمایا کہ: فلاں کام تم نے کیوں کیا؟ اور فلاں کام تم نے کیوں نہ کیا؟ (مسلم، کتاب الفضائل، باب حسن خلقہ ﷺ) غلاموں اور خادموں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتے ہوئے آپ ﷺ نے حضرت ابوذر سے فرمایا: وہ تمہارے بھائی اور تمہارے خدمت گذار ہیں، جن کو اللہ نے تمہارے ماتحت کر دیا ہے، پس جس کے ماتحت اس کا بھائی ہو، تو اس کو اسی میں سے کھلائے جو خود کھاتا ہے اور اسی میں سے اسے پہنائے جو خود پہنتا ہے اور ان پر ان کی طاقت سے زیادہ کاموں کا بوجھ نہ ڈالو، اگر تم انھیں ایسے کام سپرد کرو، تو ان کی مدد کرو۔ (متفق علیہ، بخاری، کتاب العتق، باب قول النبیؐ العبید اخوانکم) ایک دوسری روایت میں ہے کہ: جس نے اپنے غلام کو طمانچہ رسید کیا یا اس کو مارا، تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس کو آزاد کردے۔ (مسلم وابوداؤد) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ: ایک آدمی اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں خادم کو کتنی بار معاف کروں، آپ نے فرمایا: ہر دن ستر بار۔ (ابوداؤد، ترمذی) خادموں اور غلاموں کے متعلق دنیا کی کسی تاریخ و مذہب اور کسی شخصیت کے پاس ایسی تعلیم نہیں مل سکتی ہے، یہ نبیٔ رحمت ہی ہیں جن کے پاس سب کے لیے رحمت و مودت کا پیغام موجود ہے۔ حضرت ابومسعود بدریؓ کہتے ہیں: میں اپنے غلام کو کوڑے سے مار رہا تھا کہ میں نے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنی ''جان لو، اے ابومسعود!'' غصے کی وجہ سے میں آواز نہیں سمجھ سکا، جب وہ مجھ سے قریب ہوئے، تو میں نے دیکھا کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں اور وہ کہہ رہے ہیں: اے ابومسعود! جان لو، اے ابومسعود! جان لو، میں نے اپنے ہاتھ سے کوڑے کو پھینک دیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: جان لو اے ابومسعود! اللہ تم پر اس سے زیادہ قادر ہے جتنا تم اس غلام پر قادر ہو، تو میں نے کہا: میں اس کے بعد ہرگز کسی غلام کو نہیں ماروں گا۔ (مسلم، کتاب الأیمان، حدیث نمبر: ۱۶۵۹) آپ خود بتائیے رحمت و مودت کی یہ تعلیم اسلام کے علاوہ اور کہاں مل سکتی ہے؟

یتیموں اور بیواؤں کے ساتھ آپ ﷺ کی رحمت

انسانی معاشرے میں کمزور طبقوں کے ساتھ عام طور پر ظلم روا رکھا جاتا ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے خاص طور سے

یتیموں اور بیواؤں کے ساتھ رحم وکرم کی تعلیم دی ہے اور فرمایا : اے اللہ! میں لوگوں کو دو ضعیفوں کے حق سے بہت ڈراتا ہوں: (کہ ان میں کوتاہی مت کرنا) ایک یتیم اور دوسری عورت ۔ (مسند احمد، عن ابی شریح خویلد بن عمرو۔ ابن ماجہ، الادب ، باب حق الیتیم) ایک دوسری جگہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کے گھروں میں اس گھر کو بہتر اور عمدہ بتایا، جس میں یتیم کے ساتھ بہتر اور عمدہ معاملہ کیا جاتا ہے اور اس گھر کو برا بتایا جس میں یتیم کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا ہے۔ (ابن ماجہ، باب حق الیتیم، حدیث نمبر ۳۶۷۹) یتیم کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرنے کے اجر وثواب کا ذکر آپ ﷺ نے یوں کیا: جس نے کسی یتیم کے سر پر خالص اللہ کے لیے ہاتھ پھیرا، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اتنی نیکیاں لکھ دے گا جتنے بال اس کے ہاتھ نے چھوئے اور جس نے یتیم بچی یا بچے کے ساتھ جو اس کے پاس ہے حسن سلوک کیا، تو میں اور وہ جنت میں دونوں اس طرح ہوں گے اور آپ ﷺ نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملایا ۔ (مسند احمد عن ابی امامہ ، حدیث نمبر : ۲۲۳۳۸)

بیواؤں ، مسکینوں ، معاشرے کے ضرورتمندوں ، ناداروں اور معذوروں کی کفالت وخبر گیری اور ان کے ساتھ رحم وکرم کرنے والوں کی اہمیت وفضیلت کو آپ ﷺ نے یوں بیان کیا: بیواؤں اور مسکینوں کی خبر گیری کرنے والا، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔ (راوئ حدیث کہتے ہیں کہ) میرا گمان ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ: وہ اس عبادت کرنے والے کی طرح ہے جو سست نہیں ہوتا اور اس روزے دار کی طرح ہے جو ناغہ نہیں کرتا۔ (متفق علیہ، بخاری، کتاب الادب، باب الساعی علی الارملۃ) اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیواؤں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اور ان کی خبر گیری کرنا بھی اہم عبادت ہے۔

مریضوں اور بیماروں کے ساتھ آپ ﷺ کی رحمت

آپ ﷺ مریضوں اور بیماروں کی اکثر عیادت کیا کرتے تھے، ان کے ساتھ رحم وکرم کی باتیں کرتے، ان سے مل کر احوال دریافت کرتے، ان کے لیے دعائیں کرتے ، ان کو کلمے کی تلقین کرتے ، اگر مریض غیر مسلم ہوتا تو اس پر اسلام پیش کرتے اور اچھوتے انداز میں وعظ ونصیحت کرتے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا تھا، جو نبی ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا، وہ بیمار ہوگیا، تو نبی ﷺ اس کی عیادت کے لیے اس کے پاس تشریف لے گئے ، پس آپ ﷺ اس کے سرہانے بیٹھ گئے اور اس سے فرمایا: اسلام قبول کرلے، اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، جو اس کے پاس ہی تھا، تو اس نے کہا: ابوالقاسم کی بات مان لے، پس وہ مسلمان ہوگیا، پس نبی ﷺ یہ فرماتے ہوئے باہر تشریف لائے ، تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں، جس نے اس لڑکے کو جہنم کی آگ سے بچالیا۔ (بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی .....)

آپ ﷺ نے ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق بتائے ہیں، ان میں مریض کی عیادت بھی ہے۔ عیادت کے وقت مریض کو دعائیں دینی چاہیں، کیوں کہ اس

سے مریض کا دل خوش ہوتا ہے اور یہ ایک قسم کی رحمت و دلجوئی ہے ۔ آپ ﷺ سے اس سلسلہ میں بہت ساری دعائیں وارد ہیں، سب سے آسان دعاء یہ ہے کہ آپ ﷺ مریض کی عیادت کے بعد یہ کہتے تھے "لا باس طھور ان شاء اللہ" کوئی فکر نہیں، اللہ نے چاہا تو یہ بیماری گناہوں سے پاک کرنے والی ہے۔

(بخاری، کتاب المرضیٰ، باب عیادۃ الاعراب)

عیادت کرنے والے کی بھی بہت فضیلت ہے ۔ حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی مریض کی عیادت کی تو آسمان سے آواز لگانے والا (فرشتہ) آواز لگاتا ہے، تو نے اچھا کیا، تیرا چلنا اچھا ہوا اور تو نے جنت میں اپنا ٹھکانا بنالیا۔ (ابن ماجہ) ایک دوسری حدیث میں ہے: مسلمان جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے، تو واپس آنے تک وہ جنت کے تازہ پھلوں کے چننے میں مصروف رہتا ہے۔ (مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل عیادۃ المریض)

سچ تو یہ ہے کہ مریض کی عیادت سے اگر ایک طرف مریض کو سکون وچین نصیب ہوتا ہے تو دوسری طرف عیادت کرنے والوں پر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاص رحمت کی بارش ہوتی ہے۔

دشمنوں کے ساتھ آپ ﷺ کی رحمت

دشمن کو ہر انسان دشمن ہی سمجھتا ہے اور حتی الامکان اس کو زد وکوب اور مارنے پیٹنے کی گھات میں لگا رہتا ہے، اخلاقی، معاشی، اور اقتصادی نقصان کے در پے ہوتا ہے؛ لیکن آپ ﷺ نے اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی رحم وکرم کا معاملہ کیا، انھیں معاف کیا اور زندگی سنوارنے کے مواقع عنایت کیے۔ میں علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب "خطباتِ مدراس" سے ایک اقتباس نقل کر رہا ہوں جو دعوے کی بہت مضبوط دلیل ہے، آپ لکھتے ہیں:

"مکہ جب فتح ہوا تو حرم کے صحن میں، کس حرم کے صحن میں، جس میں آپ کو گالیاں دی گئیں، آپ پر نجاستیں پھینکی گئیں، آپ کے قتل کی تجویز منظور ہوئی، قریش کے تمام سردار مفتوحانہ کھڑے تھے، ان میں وہ بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے، وہ بھی تھے جو آپ کو جھٹلایا کرتے تھے، وہ بھی تھے جو آپ کی ہجویں کیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جنہوں نے آپ پر پتھر پھینکے تھے، آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، آپ پر تلواریں چلائی تھیں، آپ پر پتھر برساتے تھے، جنہوں نے آپ کے عزیزوں کا خون ناحق کیا تھا، ان کے سینے چاک کیے تھے، ان کے دل و جگر کے ٹکڑے کیے تھے، وہ بھی تھے جو غریب و بے کس مسلمانوں کو ستاتے تھے، ان کے سینوں پر اپنی جفاکاری کی آتشیں لہریں لگاتے تھے، ان کو جلتی ریتوں پر لٹاتے تھے، دہکتے کوئلوں سے ان کے جسم کو داغتے تھے، نیزوں کی انی سے ان کے بدن کو چھیدتے تھے، آج یہ سب مجرم سرنگوں سامنے تھے، پیچھے دس ہزار خون آشام تلواریں محمد رسول اللہ ﷺ کے ایک اشارے کی منتظر تھیں، دفعۃً زبان مبارک کھلتی ہے، سوال ہوتا ہے، قریش بتاؤ میں آج تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟ جواب ملتا ہے محمد! تو میرا شریف بھائی اور شریف

بھتیجا ہے، ارشاد ہوتا ہے: آج میں وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے ظالم بھائیوں کو کہا تھا ﴿ لا تثریب علیکم الیوم ﴾ آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں (اذھبوا فانتم الطلقاء) جاؤ تم سب آزاد ہو، (خطبات مدراس: ۱۴۰۔ ۱۴۱، چھٹا خطبہ: سیرت نبوی کا عملی پہلو یا عملیت)

دشمنوں کے ساتھ عفو و درگذر اور رحم و کرم کے واقعات تاریخ و سیر کی کتابوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کی مدنی زندگی کا ایک واقعہ ہے کہ نجد سے جو غلہ مکہ جایا کرتا تھا اسے نجد کے ایک سردار ثمامہ بن اثالؓ نے اس بنیاد پر بند کر دیا کہ وہ سب آپ ﷺ کے دشمن ہیں، جب آپ ﷺ کو یہ خبر ہوئی تو آپ ﷺ تڑپ گئے اور مکہ والوں کو غلہ بھیجنے کا حکم صادر فرمایا۔ (زاد المعاد، فصل فی سریۃ نجد: ۳/ ۲۴۷) اس سے بھی زیادہ تعجب خیز واقعہ یہ ہے کہ؛ ایک مرتبہ مکہ میں سخت قحط پڑا، یہاں تک کہ لوگوں نے مردار اور ہڈیاں بھی کھانی شروع کر دیں، ابوسفیان بن حرب جو ان دنوں غالی دشمن تھا، آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا: محمد! آپ لوگوں کو صلہ رحمی یعنی حسن سلوک کی تعلیم دیا کرتے ہیں، دیکھیے ! آپ کی قوم ہلاک ہو رہی ہے، خدا سے دعا کیجیے، نبی ﷺ نے دعا فرمائی اور خوب ہی بارش ہوئی۔ (رحمۃ للعالمین ۱/ ۲۶۵)

دشمنوں کی معاشی فکرمندی اور ان کے بارے میں رحم کا یہ پہلو ذرا بتائیے دنیا کے کس انسان کے اندر پایا جاسکتا ہے؟ یقیناً یہ اوصاف اسی کے ہو سکتے ہیں، جو ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہو۔

قیدیوں کے ساتھ آپ ا کی رحمت

آپ ﷺ نے قیدیوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا برتاؤ کیا اور اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا، ان کو قید میں رکھا جائے؛ لیکن ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک نہ کیا جائے۔ بنو قریظہ کے قیدیوں کے بارے میں آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو ہدایت دیتے ہوئے کہا تھا: انھیں خوش اسلوبی اور حسن سلوک سے قید کرو، انھیں آرام کا موقع دو، کھلاؤ، پلاؤ اور فرمایا تلوار اور اس دن کی گرمی دونوں کو یکجا مت کرو۔ (الموسوعۃ الفقہیۃ: ۴/ ۱۹۸) جن دنوں میں بنو قریظہ کے قیدیوں کو قید کیا گیا تھا، وہ گرمی کے ایام تھے، تپش زیادہ تھی، اس لیے آپ ﷺ نے دھوپ سے بچنے اور قیلولہ کے لیے مواقع فراہم کرنے کی تاکید کی۔ صحابہ کرامؓ نے بھی ہمیشہ قیدیوں کے ساتھ رحم و کرم کا برتاؤ کیا۔ اسیرانِ بدر کے بارے میں علامہ شبلی نعمانیؒ نے لکھا ہے: ''صحابہؓ نے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ ان کو کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے، ان قیدیوں میں ابوعزیز بھی تھے، جو حضرت مصعب بن عمیر کے بھائی تھے، ان کا بیان ہے کہ: مجھ کو جن انصاریوں نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا، جب صبح یا شام کا کھانا لاتے، تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے، مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا؛ لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ کو واپس دیتے اور یہ اس بناء پر تھا کہ آں حضرت ﷺ نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ (سیرۃ النبی از علامہ شبلی نعمانیؒ: ۱/ ۱۹۳)

ہمارے نبی کی تعلیمات میں قیدیوں کے متعلق بھی پوری تعلیم ہے، ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا جانا جیسا کہ آج

دنیا کررہی ہے بالکل روانہیں ہے اور نہ ہی غیر انسانی سلوک یعنی ان کا مثلہ وغیرہ کرنا درست ہے۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۳۴۴ پر ہے: اسیران بدر میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا، جو نہایت فصیح اللسان تھا اور عام مجمعوں میں آں حضرت ﷺ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا، حضرت عمرؓ نے کہا: یا رسول اللہ! اس کے دو نیچے کے دانت اکھڑوا دیجئے کہ پھر اچھا نہ بول سکے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: اگر میں اس کے عضو بگاڑوں تو گو نبی ہوں؛ لیکن خدا اس کی جزا میں میرے اعضاء بھی بگاڑے گا۔ (سیرۃ النبی از علامہ شبلی نعمانیؒ :۱/۱۹۳) آپ کی شان اقدس میں توہین آمیز کلمات کہنا یقیناً بڑا جرم ہے؛ لیکن اس کے باوجود آپ نے ان کے دانت اکھاڑنے کی رائے قبول نہیں کی، اس لیے کہ یہ عمل غیر انسانی اور رحم وکرم کے خلاف ہے۔

جانوروں اور پرندوں کے ساتھ آپ ﷺ کی رحمت

آپ ﷺ کے رحیمانہ و کریمانہ اخلاق صرف انسانوں کے لیے ہی نہیں ہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات حتی کہ جانوروں تک کے لیے ہیں۔ عبداللہ بن جعفرؓ بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ ایک انصاری کے احاطہ میں داخل ہوئے، اس میں ایک اونٹ تھا، اس نے جب رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تو وہ بلبلانے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، رسول اللہ ﷺ اس کے قریب تشریف لائے اور اس کے کوہان اور کنپٹیوں پر اپنا دست مبارک پھیرا، اس سے اس کو سکون ہو گیا، پھر آپ ﷺ نے پوچھا کہ اس اونٹ کا مالک کون ہے؟ ایک انصاری نوجوان آیا، اور اس نے کہا کہ: یا رسول اللہ! میرا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس جانور کے معاملے میں ـــ جس کا مالک اللہ تعالیٰ نے تم کو بنایا ہے ـــ اللہ سے نہیں ڈرتے، وہ مجھ سے شکایت کر رہا تھا کہ تم اس کو تکلیف دیتے ہو اور ہر وقت کام میں لگائے رکھتے ہو۔ (ابوداؤد، باب مایومر بہ من القیام علی الدواب)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گذر ایک ایسے اونٹ پر ہوا، جس کی پیٹھ لاغری کی وجہ سے اس کے پیٹ سے لگ گئی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: ان بے زبان جانوروں کے معاملے میں اللہ سے خوف کرو، ان پر سواری کرو تو اچھی طرح، ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت استعمال کرو تو اس حالت میں کہ وہ اچھی حالت میں ہوں۔ (ابوداؤد، باب مایومر بہ من القیام علی الدواب) بے زبانوں کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ نے رحمت کا معاملہ کیا اور اس کا حکم دیا۔ ایک آدمی نے کتے کی پیاس کی شدت کو دیکھا، جو شدتِ پیاس کی وجہ سے کیچڑ چاٹ رہا تھا، تو اس کے لیے کنویں میں اترا اور اپنے چمڑے کے موزے میں پانی بھرا اور پھر اوپر آکر کتے کو پلایا، تو اللہ نے اس کے اس عمل کو قبول فرمایا اور اس کی مغفرت فرمادی۔ لوگوں نے اس بات پر اللہ کے رسول سے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا جانوروں کے معاملہ میں بھی ہمیں اجر ملے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ہر اس مخلوق میں جو تر وتازہ جگر رکھتی ہے اس میں ثواب ہے۔ (مسلم، باب فضل سقی البہائم)

جانوروں کو ستانا اور ان کے ساتھ رحمت کا برتاؤ نہ کرنا

آدمی کے جہنم میں جانے کا بھی کبھی سبب بن جاتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ایک عورت کو صرف اس بات پر عذاب دیا گیا کہ اس نے اپنی بلی کو کھانا پانی نہیں دیا اور نہ اس کو چھوڑا کہ وہ حشرات الارض ہی سے اپنا پیٹ بھرے۔ (مسلم، کتاب السلام، باب تحریم قتل الہرۃ، حدیث نمبر: ۲۲۴۳)

جانوروں کی طرح پرندوں کے ساتھ بھی آپ نے رحمت کی تعلیم دی، حضرت ابن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ: ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، کہ آپ ﷺ ایک ضرورت کے لیے وہاں سے تھوڑی دیر کے لیے تشریف لے گئے، اس درمیان ہم نے ایک چھوٹی چڑیا دیکھی، اس کے ساتھ دو بچے تھے، ہم نے دو بچے لے لیے، وہ یہ دیکھ کر اپنے پروں کو پھڑ پھڑانے لگی، آپ ﷺ تشریف لائے اور پوچھا: کہ کس نے اس کے بچے کو چھین کر اس کو تکلیف پہنچائی ہے؟ پھر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس کے بچے کو واپس کرو، یہاں ہم نے چیونٹیوں کی ایک آبادی دیکھی اور اس کو جلا دیا، آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو کس نے جلایا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہم لوگوں نے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: آگ سے عذاب دینے کا حق صرف آگ کے رب کو ہے۔ (ابوداؤد: کتاب الجہاد، باب کراہیۃ حرق العدو بالنار)

جانوروں کو ذبح کرنے میں آپ ا کا رحیمانہ پہلو

ظلماً یا بلاضرورت کسی بھی مخلوق کو مارنا، اسے قتل کرنا اور اسے ذبح کرنا بالکل درست نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے جانوروں اور پرندوں میں سے بہت ساری قسموں کو انسانوں کے لیے بطور غذا پیدا کیا ہے، وہ انسانوں کے لیے خوراک بنائے گئے ہیں، ایسے جانوروں کو ذبح کرنا اور ان کی قربانی کرنا ظلم نہیں ہے، بلکہ حاکم کے حکم کی تعمیل ہے، جو یقیناً ظلم اور بے رحمی نہیں کہلائے گی بلکہ اسے عین اطاعت کہا جائے گا؛ لیکن ذبح کے بارے میں بھی نبی ﷺ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ جانوروں پر ظلم نہ کیا جائے، بلکہ پورے ادب واحترام سے انھیں رکھا جائے، ذبح سے پہلے اسے کھلایا پلایا جائے، چاقو کو اچھی طرح تیز کرلیا جائے اور زیادہ دیر تک اسے لٹا کر نہ رکھا جائے۔ حضرت شداد بن اوسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے ساتھ اچھا معاملہ کرنے اور نرم برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے، اس لیے اگر قتل بھی کرو تو اچھی طرح، ذبح کرو تو اچھی طرح کرو، تم میں سے جو ذبح کرنا چاہے، وہ اپنی چھری پہلے تیز کرے اور اپنے ذبیحہ کو آرام دے۔ (مسلم، کتاب الصید، باب الامر باحسان الذبح) ایک دوسری حدیث میں ہے جو ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ایک بکری زمین میں ذبح کرنے کے لیے لٹائی اس کے بعد چھری تیز کرنا شروع کیا، رسول اللہ ﷺ نے یہ دیکھ کر فرمایا: کیا تم اس کو دو بار مارنا چاہتے ہو، اس کو لٹانے سے پہلے تم نے چھری تیز کیوں نہ کرلی؟

(مستدرک، کتاب الاضاحی، حدیث نمبر: ۷۵۶۳ اور حاکم کا قول ہے کہ یہ حدیث بخاری کی شرط پر صحیح ہے، ذہبی نے تلخیص میں کہا کہ یہ حدیث بخاری کی شرط پر ہے۔)

جنگی امور میں آپ ﷺ کی رحمت

جنگ کا نام آتے ہی ذہن میں مار دھاڑ، بے رحمی و

بے مروتی اور ظلم و زیادتی کی تصویر چھا جاتی ہے؛ لیکن تعلیمات نبوی نے اس میں بھی رحمت کا پہلو شامل کیا ہے اور اس کی تاکید کی ہے؛ بلکہ اس کو ضروری قرار دیا ہے۔ اسلام سے پہلے جنگ کا جو طریقہ تھا اور جس قسم کے وحشیانہ افعال عمل میں آتے تھے ان کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ اسلام نے جنگی امور کی اصلاح کی اور عورتوں، بوڑھوں، بچوں، صغیر السن، نوکروں اور خادموں کو قتل کرنے کو سختی سے منع کیا اور اسے قطعاً روک دیا۔ آپ ﷺ کا دستور تھا کہ جب کسی مہم پر فوج بھیجی جاتی تو سردار فوج کو جو احکام دیتے، ان میں ایک لازمی حکم یہ بھی ہوتا ''**لاتقتلوا شیخاً فانیاً ولا طفلاً ولا صغیراً ولا امرأۃً**'' (ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی دعاء المشرکین، حدیث نمبر: ۲۶۱۴) کسی کہن سال کو، بچے کو، کمسن کو اور عورت کو قتل نہ کرو۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ایک غزوہ کے موقع پر فرمایا، بلکہ ایک شخص کو بھیج کر منادی کروائی کہ: جو دوسروں کو گھر میں تنگ کرے یا لوٹے مارے، اس کا جہاد قبول نہیں۔ (ابوداؤد، کتاب الجہاد) جنگی امور میں آپ جیسی مشفقانہ، رحیمانہ اور کریمانہ تعلیمات کہیں نہیں ملتی ہیں۔

جنگ کے نام سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ محض ظلم ہی ہے، بلکہ مقاصد کے مطابق اس پر حکم لگایا جاتا ہے، کبھی یہ عین ضرورت بھی ہو جاتی ہے تو کبھی ظلم و زیادتی بھی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جتنی جنگیں کیں سب عین ضرورت تھیں؛ لیکن اس کے باوجود آپ نے بے جا قتل و غارت نہ کی اور نہ ہی اس کی اجازت دی۔

بوڑھوں، کمزوروں اور بے کسوں کے ساتھ آپ ﷺ کی رحمت

بوڑھے، کمزور اور بے کس انسانوں کے ساتھ آپ ﷺ نے رحم و کرم کا معاملہ کیا اور اس کا حکم بھی دیا کہ ان کا ادب و احترام کیا جائے، انھیں مصیبت و مشقت والے کاموں سے بچایا جائے، ان کا تعاون کیا جائے اور ان کے ساتھ رحمت کا پہلو اختیار کیا جائے۔ تاریخ کے صفحات نے آپ ﷺ کے رحم و کرم کا یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ: ایک روز آپ ﷺ کسی مکان کے سامنے سے گذر رہے تھے، دیکھا ایک عورت جو کسی کی کنیز تھی، اس کے سامنے گیہوں کا ڈھیر پڑا ہوا ہے، کمزوری اور بیماری کی وجہ سے اس کے کمزور ہاتھوں سے چکی بار بار چھوٹ جاتی ہے، ایک آہ بھرتی ہے اور پھر پیسنے میں لگ جاتی ہے، آپ ﷺ کا دردمند دل تڑپ اٹھا، آگے بڑھے، اس سے کہا کہ تم آرام کرو اور خود سارے گیہوں رحمت عالم ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے پیس کر اس غریب کی مدد کی اور ظالم آقا سے بچالیا۔ (نبی رحمت کا پیام رحمت، از: مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی: ۱۰۰/) نبی رحمت ﷺ کی دلسوزی و دردمندی کے اس جیسے بہت سارے واقعات آپ کو تاریخ و سیر کی کتابوں میں مل جائیں گے۔

عمر میں بڑے اور بوڑھوں کے ساتھ ادب کے ساتھ پیش آنے کی تعلیم آپ ﷺ نے یوں دی: جو نوجوان کسی بوڑھے کی اس کے بڑھاپے کی وجہ سے عزت کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایسے اشخاص مقرر فرما دیتا ہے، جو اس کے بڑھاپے میں اس کی عزت کریں گے۔ (ترمذی، ابواب البر

والصلۃ ، باب ماجاء فی اجلال الکبیر)اسی طرح آپ ﷺ نے بڑوں کا ادب واحترام اور چھوٹوں پر شفقت نہ کرنے پر تنبیہ کرتے ہوئے یوں فرمایا: اس شخص کا تعلق ہم سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور ہمارے بڑے کے شرف و فضل کو نہیں پہچانتا۔ (ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الرحمۃ ۔ترمذی، ابواب البر والصلۃ)

فتح مکہ کے بعد جب ابوبکر صدیقؓ اپنے بوڑھے، ضعیف، فاقد البصر باپ کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بیعتِ اسلام کرانے کے لیے لائے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا :تم نے بوڑھے کو کیوں تکلیف دی، میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔ (مسند احمد عن انس، حدیث نمبر:۱۲۶۵۶)

آپ ﷺ کی رحمت نبوت سے پہلے اور اس کے بعد

آپ ﷺ کی زندگی کے دونوں زمانے یعنی نبوت سے پہلے اور اس کے بعد رحم وکرم اور شفقت ومہربانی کی تعلیمات سے بھرے ہوئے ہیں ، اگر کہیں ''جنگ و جدال'' یا بالفاظ دیگر ''جہاد'' کا ذکر ہے، تو وہ بھی معاشرے سے ظلم وزیادتی اور ناانصافی کے خاتمے اور امن وسکون کے قیام کے لیے ہوا ہے، جس کی مثال اس رحم دل سرجن ڈاکٹر سے دی جاسکتی ہے، جو کسی کا آپریشن اسے تکلیف دینے کے لیے نہیں، بلکہ اسے راحت وآرام اور سکون وچین پہنچانے کے لیے کرتا ہے۔ ابھی تک نبی ﷺ کی جن رحیمانہ تعلیمات کا آپ مطالعہ کررہے تھے وہ سب نبوت کے بعد کی ہیں اور وہ سب اسلامی تعلیمات کا ایک اہم حصہ ہیں۔

نبوت سے پہلے بھی آپ رحیم وکریم تھے، جب آپ ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ ﷺ گھبرائے گھبرائے تھے، تو حضرت خدیجہؓ نے آپ کو دلاسا دیتے ہوئے جن باتوں کا تذکرہ کیا، وہ سب آپ کی رحمت سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ نبوت سے پہلے کے اعمال ہیں ۔ حضرت خدیجہؓ کہتی ہیں: ہرگز نہیں! خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی بھی رسوا نہیں کرے گا، آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں ، ناتوانوں کا بوجھ اپنے اوپر لیتے ہیں ،محتاجوں کے لیے کماتے ہیں، مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی راہ میں مصیبتیں اٹھاتے ہیں ۔ (بخاری، کتاب الوحی، باب کیف کان بدء الوحی.....حدیث:۲)

یہ تھیں نبی رحمت کے رحیمانہ پہلوؤں کی چند جھلکیاں، جن کا آپ مطالعہ کررہے تھے، اگر مزید گہرائی و گیرائی سے نگاہ ڈالی جائے، تو گفتگو کی اور بھی شاخیں نکل سکتی ہیں، سچ تو یہ ہے کہ نبی ﷺ کے کسی بھی وصف کو بیان کرنے کے لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ ع

سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے حبیب سیدنا محمد ﷺ کی ایک ایک سنت اور ایک ایک تعلیم پر عمل کرنے والا بنادے۔

(وما توفیقی الا باللہ ، علیہ توکلت ، و الیہ انیب .)

☆☆☆

تاریخ کے جھروں کے سے

(آخری قسط)

عہد اسلامی کے شفاخانے

تحریر: مولانا واضح رشید حسنی ندوی
ترجمہ: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

عہد اسلامی کا پہلا اسپتال ولید بن عبدالملک کے زمانے میں قائم ہوا، یہ اسپتال جذامیوں کے لئے خاص تھا، اس کے بعد پھر مسلسل اسپتالوں کے قیام کا سلسلہ چلتا رہا، اسپتالوں کو اس زمانے میں مارستان کے نام سے جانا جاتا تھا۔

اسپتال دو طرح کے ہوا کرتے تھے ایک تو وہ جو آج کل کے میڈیکل کیمپ (Medical Camp) کے مشابہ تھے اور دوسرے مستقل اسپتال تھے، کیمپ کے طرز کی پہلی مثال مسلمانوں کے یہاں نبی پاکؐ کے عہد میں ملتی ہے، جب کہ آپؐ نے غزوہ خندق میں زخمیوں کے علاج کے لیے ایک خیمہ نصب کرایا تھا، جب حضرت سعد بن معاذؓ کو ان کی آنکھ میں زخم لگا تو نبی کریمؐ نے کہا ان کو ریلیف کیمپ (Relief Camp) میں پہنچایا جائے تاکہ میں قریب سے ہی عیادت کرسکوں، اسلام کا یہ پہلا فوجی میڈیکل کیمپ (Army Medical Camp) تھا پھر خلفاء وملوک نے ان میڈیکل کیمپوں میں ایسے اضافے کیے کہ سلطان محمود السلجوقی کے عہد میں اس منتقل ہونے والے میڈیکل کیمپ کا سامان ۴۰ر اونٹوں پر لادا جاتا تھا، اس میں وہ تمام چیزیں فراہم ہوتی تھیں جن کی مریضوں کو علاج کے لیے ضرورت ہوتی ہے مثلاً کھانے پینے کا سامان، کپڑے، متعدد طبیب، ڈسپنسری (Dispensary) وغیرہ، جہاں جہاں مستقل اسپتال قائم نہیں تھے وہاں گاؤں گاؤں یہ میڈیکل کیمپ لگائے جاتے تھے۔

مسلمانوں کے متمدن شہروں اور حکومتوں کے پایۂ تخت میں بے شمار مستقل اسپتال قائم تھے، صرف قرطبہ میں ۵۰ ارسپتال تھے، وہاں آرمی اسپتال الگ تھے جہاں مخصوص اطباء ہوا کرتے تھے۔ قیدخانوں کے علیحدہ اسپتال تھے جہاں اطباء روزانہ راؤنڈ لیا کرتے تھے، اور مریض قیدیوں کا معالجہ کیا کرتے تھے انھیں لازمی دوائیں دیتے تھے، فوری طبی امداد (First medical aid) کا انتظام مساجد کے قریب یا عام مقامات (Public Places) پر کیا جاتا تھا۔

تمام اسپتال عام تھے ان میں سب کا علاج کیا جاتا تھا، مردوں کے لیے الگ اور عورتوں کے لیے الگ شعبے قائم کیے جاتے تھے، دونوں ہی شعبوں میں متعدد ہال ہوتے تھے۔ ایک ہال ایک قسم کے مریضوں کے لیے

خاص ہوتا تھا، داخلی امراض ،عقلی امراض، ہڈی کے امراض اور پلاسٹر وغیرہ کے ساتھ سرجری کے مریضوں کے لیے مخصوص ہال ہوتے تھے۔

یہ اسپتال طبی مدارس (Medical colleges) کی بھی حیثیت رکھتے تھے، جہاں سے اطباء باضابطہ سند فراغت حاصل کیا کرتے تھے، ہر اسپتال میں کتب طب سے معمور ایک کتب خانہ ہوا کرتا تھا، یہی نہیں بلکہ وہ تمام اشیاء مہیا ہوتی تھیں جن کی ڈاکٹروں اور طب کے طلبہ کو ضرورت پڑتی تھی۔

مشہور اسپتالوں میں بغداد کا المستشفی العضدی قابل ذکر ہے، جس کو ۳۷۱ھ میں عضد الدولہ بن بویہ نے تعمیر کیا تھا، المستشفی النوری الکبیر دمشق میں تھا جس کو سلطان الملک العادل نور الدین نے بنایا تھا، المتشفی المنصوری الکبیر جو مارستان قلاوون کے نام سے مشہور تھا اس کی عمارت بعض امراء کے مکانات تھے لیکن الملک سیف الدین قلاوون نے اس کو ۶۸۳ھ میں اسپتال میں تبدیل کر دیا اس کے علاوہ مراکش کا اسپتال بہت معروف تھا جس کو مغرب میں موحدین بادشاہوں میں سے المنصور ابو یوسف نے قائم کیا تھا۔

اسپتال میں داخلہ (Admision) تمام مریضوں کے لیے بالکل مفت تھا، اس میں غنی وفقراء، قرب و بعد یا گمنام ومشاہیر کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا، پہلے باہر کے ہال (O P D) میں مریضوں کی تشخیص (Investigation) کی جاتی ، اگر ہلکا پھلکا مرض ہوتا تو اسے نسخہ لکھ کر اسپتال کی ڈسپنسری سے دوائیں دے دی جاتیں، اور جو مریض اسپتال میں داخلے (Admit) کے لائق ہوتا اسے داخل اسپتال کر دیا جاتا اور اس کا نام درج (Registeration) کر دیا جاتا، پھر اس کو حمام لے جا کر اسپتال کے خاص ہال میں اس کو رکھا جاتا اور اس کے لیے خاص چارپائی اور بہترین بستر دیا جاتا، پھر ڈاکٹر اس کے لیے جو دوا تجویز کرتا وہ دی جاتی اور اس کی صحت کے موافق غذا فراہم کی جاتی لیکن اتنی ہی جتنی ڈاکٹر اس کے لیے تجویز کرتے ،مریضوں کی غذا بکری ،گائے ، پرندے اور مرغیوں کا گوشت ہوا کرتا تھا، مریضوں کی شفاء کی علامت یہ سمجھی جاتی تھی کہ مریض ایک ہی مرتبہ میں پوری روٹی اور پوری مرغی کھالے، پھر جب ذرا صحت ہو جاتی تو صحت مند لوگوں کے لیے مخصوص کمروں میں اس کو رکھا جاتا ، پھر جب مکمل صحت یاب ہو جاتا تو کپڑوں کے ایک نئے جوڑے کے ساتھ اتنا مال بھی دیا جاتا کہ وہ کسی عمل یا کاروبار پر قادر ہو سکے۔

اسپتال کے کمرے نہایت صاف ستھرے ہوا کرتے تھے، ان میں پانی بھی موجود ہوتا تھا، بڑے خوبصورت اور منظم فرش ہوتے تھے۔ ہر کمرے کے لیے صفائی کے نگراں مقرر ہوتے تھے، مال و اسباب کے محافظوں کا تقرر ہوتا تھا، بیشتر اوقات خلیفہ و امیر بذات خود مریضوں کی مزاج پرسی کرتا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا۔(۱)

تمام شد

حواشی

۱۔ من روائع حضارتنا، ڈاکٹر مصفطی السباعی، ص: ۲۲۵-۲۲۶۔ ☆☆☆

بحث ونظر

دینی نصابِ تعلیم کی بنیادی خصوصیت

محمد جرجیس کریمی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

دینی اور عصری نصاب تعلیم کے درمیان سب سے بنیادی فرق یہ ہے کہ عصری تعلیم معرفتِ اشیاء کا نام ہے اور دینی تعلیم معرفت الٰہی کا نام ہے اور دونوں معرفتوں کے اثرات جدا جدا ہیں، جو زندگی میں گہرے طریقے سے ظاہر ہوتے ہیں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دینی تعلیمی اداروں میں آغاز ہی سے بچوں کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بتایا جاتا ہے اور اس کی صفات واوصاف سے واقف کرایا جاتا ہے۔ جب کہ عصری اسکولوں میں بچوں کو چیزوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ فلاں چیز کیا ہے اور کیسی ہے؟ اس کی خصوصیات وفوائد کیا ہیں؟ اس نصاب میں آخر تک کوئی ایسا مرحلہ نہیں آتا ہے کہ جب پڑھنے والے کو بتایا جاتا ہو کہ ان چیزوں کا کوئی خالق ہے جس نے اپنے ارادہ اور قدرت سے ان کو وجود بخشا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بنیادی فرق سے ان اداروں میں پڑھنے والوں کی زندگیاں الگ الگ ہوتی ہیں۔

کائنات کی سب سے بڑی حقیقت اللہ تعالیٰ کا وجود ہے، اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اس کے حکم سے دن رات اور موسموں کی تبدیلی ہوتی ہے، اس کی قدرت سے پیڑ پودے اگتے ہیں، اس کی مشیت وارادے سے انسان کو دل ودماغ اور شعور وفہم عطا ہوا ہے، جس کی وجہ سے وہ دوسری مخلوقات سے ممتاز ومنفرد ہے، اللہ تعالیٰ ساری مخلوقات کو روزی فراہم کرتا ہے، وہی مارتا اور جلاتا ہے۔ اسی کے حکم سے بیماری پیدا ہوتی ہے اور شفا ملتی ہے۔ امراض کے اسباب اور علاج کے لئے دوائیں اسی کی پیدا کردہ ہیں، موت وحیات اللہ کے حکم سے ہے، اس نے بندوں کو زندگی گذارنے کے لئے کچھ احکام دیئے ہیں جن پر عمل کرنا واجب ہے اور جس سے اس کا رب خوش ہوتا ہے، سارے انسان آدم وحوا کی اولاد ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا تھا لہذا سب انسان برابر ہیں، غرض کہ اس طرح کے بے شمار عقائد وتعلیمات دینی تعلیمی اداروں میں بچوں کو اول دن سے دی جاتی ہیں۔

بچہ جب پہلی بار مدرسہ پہنچتا ہے تو سب سے پہلے اس

کو ''بسم اللہ'' سکھایا جاتا ہے۔اس کے معنی ہیں کہ وہ جس علم کے حصول کا آغاز کررہا ہے اس کا منتہا اللہ کی ذات ہے۔وہ اللہ تعالیٰ کی ذات جس کے بارے میں کہا گیا کہ اگر زمین کے سارے درخت قلم اور سارے سمندروں کو روشنائی بنالی جائے تب بھی اس کے حمد وثنا کے کلمات پورے نہیں ہوں گے حتیٰ کہ اگر سات بار ایسا ہی کیا جائے تب بھی اللہ تعالیٰ کی باتیں نہیں لکھی جاسکتی ہیں ۔ارشاد ہے:''ولوان مافی الارض من شجرة اقلام و البحر یمده من بعده سبعة ابحر مانفدت کلمٰت الله ان الله عزیز حکیم ''(لقمان :۲۷) زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر روشنائی بن جائیں جسے سات مزید سمندر روشنائی فراہم کریں تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے)ختم نہ ہوں گی، بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔

پھر اس کے بعد بچے کو یہ دعا سکھائی جاتی ہے:الھم رب زدنی علما (اے اللہ میرے علم میں اضافہ فرما)اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا ایک مظہر یہ ہے کہ اس نے انسان کو علم عطا کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے :''الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمه البیان ''(الرحمن : ۱-۳) وہ رحمٰن ہے جس نے قرآن سکھایا، اس نے انسان کو پیدا کیا اور بولنا سکھایا۔

اس سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان کا علم محدود ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اس کے علم میں وسعت لاسکتا ہے جس کی وہ دعا مانگ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:وما اوتیتم من العلم الاقلیلا (الاسراء:۸۵)۔ تمہیں تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

پھر اس کو ''الحمد لله رب العالمین '' کی تعلیم دی جاتی ہے جس کے معنی ہیں کہ یہ دنیا ربوبیت کی محتاج ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا رب ہے جو اس کو چلا رہا ہے۔اس طرح درجہ بدرجہ بچے کو اللہ تعالیٰ کی معرفت دی جاتی ہے۔اس سے وہ اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی ایک امانت سمجھتا ہے اور اس کے دیئے ہوئے احکام کے مطابق اس کو گذارنے کی کوشش کرتا ہے،جس سے بچے کے اخلاق و کردار میں بلندی اور رفعت پیدا ہوتی ہے اس طرح وہ ایک ذمہ دار شہری بنتا ہے۔

اس کے برعکس عصری اسکولوں میں اول دن سے صرف چیزوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے،اس کے مختلف موضوعات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے جیسے مختلف زبانوں اردو، ہندی، انگلش کی تعلیم میں کہیں خالق کا ذکر نہیں آتا، ریاضی بھی خالص فنی چیز ہے اس میں نمبروں اور حساب و کتاب کی تعلیم دی جاتی ہے کسی بھی مرحلے میں ریاضی معرفتِ الٰہی کا ذریعہ نہیں بن سکتی، جنرل نالج میں بھی اللہ تعالیٰ کا حوالہ نہیں آسکتا ۔ علمِ ماحولیات (E.V.S.) میں پیڑ، پودوں اور صفائی ستھرائی کی تعلیم دی

جاتی ہے،علمِ سائنس میں اشیاء کی معرفت کرائی جاتی ہے۔ غرض کہ اس طرح بچہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بغیر علم کا آغاز بھی کرتا ہے اور انجام تک اس کو پہنچاتا ہے مگر کہیں بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر تک نہیں آتا ہے۔نتیجہ کے طور پر عصری تعلیم یافتہ فرد کائنات میں اپنی حیثیت کا تعین کر پاتا ہے نہ اپنے وجود کے مقصد تک وہ رسائی حاصل کر پاتا ہے،انجامِ کار کے طور پر وہ دنیا میں بے مقصد زندگی گزارتا ہے اور سوائے کھانے، پینے اور اپنی خواہشات پوری کرنے کے اس کے اندر نہ کوئی اخلاقی بلندی ہوتی ہے نہ ذمہ دارانہ تصور ہوتا ہے۔

اس بات کی طرف علامہ اقبال نے اپنے بعض اشعار میں اشارہ فرمایا ہے ؎

ڈھونڈ نے والا ستاروں کی گذر گاہوں کا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسے
جس نے سور ج کے شعاعوں کو گرفتار کیا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
آج تک فیصلۂ نفع وضرر کرنہ سکا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

ایک دوسرے شعر میں وہ کہتے ہیں:

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلائے گا الحاد بھی ساتھ

خدا کی ضرورت کیوں؟: موجودہ دور میں انسان نے مختلف علوم وفنون میں بے پناہ ترقی کی ہے، زندگی کے وسائل وذرائع میں کافی اضافہ ہوگیا ہے، ہر شعبہ علم میں روز افزوں نئے نئے انکشافات ہورہے ہیں۔انسان چاند سے آگے مریخ پر جانے کے لیے کمند ڈال رہا ہے، میڈیکل سائنس میں انسان کے مختلف اعضاء تبدیل کیے جارہے ہیں، مواصلات کے پہلو سے دنیا ایک گاؤں بن چکی ہے ،ان تمام ترقیوں کے باوجود انسان کی حالت دگرگوں ہے، دنیا میں لاکھوں نفوس ہر سال مختلف ذہنی ،نفسیاتی اور سماجی اسباب کے تحت خودکشی کی نذر ہورہے ہیں۔دنیا میں مختلف جارحانہ جرائم میں بے پناہ اضافہ ہورہا ہے۔اس کے علاوہ دنیا کے مختلف گروہوں اور قوموں کے درمیان خونی تصادم جاری ہے اور بظاہر اس کو روکنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے ظاہر ہے کہ یہ تضاد خدا سے دست برداری کا نتیجہ ہے۔ ایک طرف آنکھوں کو خیرہ کرنے والی ترقیاں ہیں تو دوسری طرف انسانوں کی آہوں اور کراہوں کی آوازیں ہیں،ایک طرف بلند و بالا عمارتیں ہیں تو دوسری طرف انسان کی اخلاقی پستیاں ہیں،ایک طرف حیرت انگیز سائنسی ترقیوں کے عجائبات ہیں تو دوسری طرف انسانوں کی خواہشات نفسانی کے دلدل میں پھنسا ہونا ہے،ان تمام مظاہر کا بنیادی سبب الحاد اور خدا بیزاری ہے،خدا کے اقرار اور اس پر ایمان سے آدمی کے اندر اس کا خوف ، اس کی گرفت کا ڈر اور آخرت میں جوابدہی کا تصور پیدا ہوتا ہے، دوسری صورت

میں انسان بے لگام ہوجاتا ہے اور اس کی زندگیاں اضطرابات سے بھر جاتی ہیں۔ دینی نظام تعلیم میں اول روز سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں بتایا جاتا ہے تاکہ بچے کی ایسی ذہنی تربیت ہو کہ بڑا ہو کر وہ خدا سے بیزار نہ ہو اور اپنی زندگی کو اس کے احکام کے تابع بنا کر گزارے۔ اس کے برعکس عصری نظامِ تعلیم میں اول سے آخر تک کہیں بھی خدا کے لئے جگہ نہیں ہے ظاہر ہے کہ اس کے بھیانک نتائج انسانوں کو جھیلنے پڑتے ہیں۔

معرفتِ اشیاء کس حد تک؟ اسلام دینِ فطرت ہے اور انسان کی ضروریات کی وہ کبھی نفی نہیں کرتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو حصولِ علم کے مختلف ذرائع دیئے ہیں جیسے سمع و بصر اور دل و دماغ وغیرہ اس کے علاوہ غور وفکر اور استنباط و استخراج کی اس کے اندر صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں اس کا تقاضا ہے کہ وہ ان ذرائع علم کو کام میں لائے اور چیزوں سے فائدہ اٹھائے کیوں کہ کائنات کی چیزیں اس کے لئے مسخر کردی گئی ہیں مگر اسلام انسان کو اس سے آگے لے جانا چاہتا ہے اور کسبی وظاہری ذرائع علم سے آگے وہبی ذریعہ علم بھی اس کو عطا کرتا ہے جس کو وحی کہا جاتا ہے، اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان کی مادی اور روحانی ضروریات محض معرفتِ اشیاء سے پوری نہیں ہوتی ہیں بلکہ اس کو وحی کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ براہِ راست اپنے خالق و مالک کی مرضیات سے واقف ہو سکے اور ان کے مطابق وہ اپنی زندگی گزارے۔ معرفتِ اشیاء اس کے لئے ہے مگر وہ اللہ کے لئے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الم ترو ا ان اللہ سخر لکم مافی السموٰت و مافی الارض (لقمان: ۲۰) کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہیں۔

دوسری طرف انسان کی تخلیق کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت قرار دیا گیا، ارشاد ہے: وماخلقت الجن و الانس الا لیعبدون (الذاریات: ٥٦) میں نے جن و انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کی حیثیت دوہری ہے۔ کائنات میں اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے اس کائنات کو برتنا بھی ہے اور اپنے تخلیقی مقصد کی تکمیل بھی ضروری ہے اور الٰہ اور رب کی معرفت بھی ضروری ہے ۔محض معرفتِ اشیاء سے اس کی مادی اور روحانی ضروریات کی تکمیل نہیں ہوتی اسی طرح معرفتِ الٰہی کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ بالکلیہ معرفتِ اشیاء کی نفی کردے۔ دونوں کے درمیان توازن کی ضرورت ہے۔ دنیا میں جو مختلف علوم وفنون میں ترقیاں ہورہی ہیں ان سے بالکلیہ آنکھیں بند کرلینا بھی مناسب رویہ نہیں ہے۔ ان سے استفادہ کرنا چاہئے اور دینی نصاب تعلیم میں معرفتِ الٰہی کے ساتھ معرفتِ اشیاء کا بھی نظم ہونا چاہئے۔

☆☆☆

○ تعلیم وتربیت

مسلم والدین کا اپنی اولاد کے ساتھ برتاؤ☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

تمہید!

انسانی زندگی میں اولاد ایک انسان کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے، اولاد کی زندگی والدین کی خوشی کا سبب اور اس کا سکون وچین والدین کے اطمینان وسکون کا باعث ہے، والدین کی زندگی اولاد کے ساتھ حیات انسانی کی لذتوں، رعنائیوں اور خوشگواریوں سے شادکام ہوتی ہے، اللہ کو ملجاؤماوٰی اور مرکز امید سمجھنے کے بعد والدین اولاد کو ہی اپنی امیدوں کا مرجع تصور کرتے ہیں، یہ بھی صحیح ہے کہ اولاد کے سبب ان کے رزق میں برکتوں کا نزول ہوتا ہے، رحمتیں اترتی ہیں اور اجر میں اضافہ ہوتا ہے۔

لیکن یہ بھی بہت بڑی حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا امور کے حصول کا انحصار محض اولاد کی اچھی تربیت پر ہے، اولاد کی صالح تربیت ان میں خیر کے پہلوؤں کو جنم دیتی ہے اور پھر وہ سعادت وفرمانبرداری اور نیکی واطاعت گذاری کی علامت ثابت ہوتے ہیں، اگر یہ صفات کسی کی اولاد میں پیدا ہوجائیں اور کسی کو ایسی اولادیں میسر ہوجائیں جوان خصوصیات کی حامل ہوں تو بجا طور پر وہ اپنے والدین کے لئے دنیا کی زیب وزینت قرار پائیں گی اور پھر وہ اولادیں باری تعالی کے اس ارشاد کا مصداق ہوں گی المال والبنون زینة الحیوٰة الدنیا (۱) ترجمہ:۔''یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس سے محبت فرمایا کرتے تھے اس کو کثرت مال اور کثرت اولاد کی دعاء دیا کرتے تھے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ وہ اپنی والدہ اور اپنی خالہ کے ساتھ حضورؐ کے پاس گئے، رسولؐ نے ان کو نماز پڑھائی، پھر ان کے لئے دعاء خیر کی، پھر ام انسؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ انسؓ آپ کے چھوٹے سے ایک خادم ہیں ان کے لئے اللہ تعالی سے دعا فرمایئے، تو آپؐ نے ان کے لئے دعاء خیر فرمائی اور اپنی دعا کے آخر میں فرمایا ''یا اللہ ان کو کثیر مال اور ان کو کثیر اولاد عطا فرما اور ان پر برکتیں نازل فرما''(۲)

لیکن اس نعمت اور حسین تصویر کا دوسرا رخ یہ

☆ یہ دراصل دکتور علی الہاشمی کی شاندار کتاب شخصیة المسلم کما یصوغہا القرآن والسنة کی ایک فصل کا ترجمہ ہے۔

ہے کہ اولاد کی صحیح تربیت نہ کی جائے ،اور اس کو صحیح رخ نہ دیا جائے تو یہی اولاد والدین کے لئے مصیبت ،وبال جان اور زندگی کا درد بن جاتی ہے، پھر اس سے صرف دن کی تھکن اور راتوں کی بے کلی ہاتھ آتی ہے ،سارا سکون غارت ہوکر رہ جاتا ہے اور زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔

اولاد کی تر بیت ایک بڑی ذمہ داری ھے :۔

سچے اور باخبر مسلمان کو اپنی اولاد کی تربیت کے متعلق واجبی ذمہ داری کا ادراک ہونا چاہئے کیوں کہ اس کو جس کو وہ اپنا سرمایۂ حیات سمجھتا ہے ،قرآن کا یہ فرمان پوری طاقت کے ساتھ اسے اس فرض کا احساس دلاتا ہے "یا أیھا الذین آمنوا قوا أنفسکم و أھلیکم نارا وقودھا الناس والحجارۃ" (۳) ''اے ایمان والو!تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں''۔

رسول کریمؐ کا یہ ارشاد گرامی بھی اس کو اس سلسلہ میں ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ والمرأۃ رعیۃفی بیت زوجھا ومسئولۃ عن رعیتھا ،والخادم راع فی مال سیدہ ومسئول عن رعیتہ فکلکمراع ومسئول عن رعیتہ (۴)

تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور ہر ایک کو اپنی ذمہ داری کے متعلق جواب دینا پڑے گا ،چنانچہ امام ذمہ دار ہے وہ اپنے رعایا کے متعلق جوابدہ ہوگا ،آدمی اپنے اہل وعیال کا ذمہ دار ہے اسے ان کے متعلق جواب دینا پڑے گا۔عورت اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار ہے اسے اس کے متعلق جواب دینا ہوگا ،خادم اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے اسے اپنی ذمہ داری کا جواب دینا پڑے گا ،غرض یہ کہ تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور ہر ایک کو اپنی ذمہ داری کا جواب دینا پڑے گا۔

ذمہ داری کا یہ وسیع تصور جو اسلام نے دیا ہے اس سے کسی زندہ شخص کو مفر نہیں ،ذمہ داریوں کا یہ پھندا ہر شخص کے گلے میں پڑا ہے ،اس لئے والدین کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ان کو بھی اپنی اولاد کی اچھی اور مکمل دینی تربیت کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے ،اس کو نیک اور صالح خطوط پر پروان چڑھانا ان کی ذمہ داری ہے ،اس کو اچھے اخلاق سے مزین کرنا والدین کا فریضہ ہے ،اولاد کی تر بیت مکارم اخلاق کی تعلیم کی بنیاد پر ہونی چاہئے کہ حضور پاکؐ نے خود فرمایا ہے کہ ان کو محض مکارمِ اخلاق کی تعلیم دینے اور لوگوں میں اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لئے مبعوث کیا گیا ہے ،آپؐ نے فرمایا!انما بعثت لأ تمم صالح الأخلاق (۵) مجھے صرف اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔

بچوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا حکم دینا اور ان کی دینی تر بیت کو اپنی واجبی ذمہ داری سمجھنا والدین کے لئے ضروری ہے ،اس کی سب سے بڑی دلیل علماء کے مطابق حضورؐ کا یہ ارشاد ہے جو ہر گھر کے لئے ہے

اور ہر گھر میں سنا جاتا ہے اور پھر اکثر لوگ اس کی کھلی مخالفت کرتے ہیں،حضورؐ نے فرمایا:مـروا أولادکـم باالصلاۃ وھم أبناء سبع سنین ،واضربوا ھم علیھا وھم أبناء عشر (٦)''جب تمہارے بچے ۷ سال کے ہو جائیں تو انہیں نماز کا حکم دواور جب ۱۰ سال کے ہو جائیں تو اس کو ترک کرنے پر انہیں مارو!

یہ واضح اور صریح ارشاد، ہر گھر کو مخاطب کرتا ہے،لیکن کتنے ایسے والدین ہیں جو دیدہ دلیری کے ساتھ اس حدیث کی مخالفت کرتے ہیں، وہ نہ بچے کو نماز کا حکم کرتے ہیں اور نہ دس سال مکمل ہونے کے بعد اسے سزا دیتے ہیں،ظاہر ہے کہ ان والدین کو اپنی اس عظیم ذمہ داری کا احساس ہونا چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کو ایسا ماحول فراہم کریں اور ان کے لئے ایسے وسائل اور غذائیں فراہم کریں کہ بیک وقت ان کے جسم،عقل اور روح کی نشونما یکساں طور پر ممکن ہو سکے۔

ایک مسلمان کو اولاد کی تربیت میں بہترین طریقے اختیار کرنا چاھئے :۔

عقلمند مسلمان والدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں کی نفسیات کا اندازہ کریں اور پھر اسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کریں،نفسیات کا پتہ لگا کر ان کے لئے صاف و پاکیزہ ماحول فراہم کریں اور ان کی بہتر دینی تربیت کے لئے اچھے طریقوں کا استعمال کریں۔

والدین کو چاہئے کہ مختلف ذرائع کا استعمال کر کے بچوں پر اپنی محبت کا اظہار کریں ،ان سے قریب ہوں، ان کے عقلی معیار اور زمانے کے تقاضوں کی رعایت کریں ،کبھی ان کے ساتھ ہلکا پھلکا کھیل کھیلیں ،خوش مزاجی کی باتیں کریں،ہلکا سا مذاق بھی کریں،ان کو ایسے الفاظ محبت کے ذریعہ بار بار خطاب کریں کہ جن سے بچوں کا دل پسیج جائے اور وہ بھی والدین سے محبت کرنے لگیں ،اور پھر وہ بصد شوق ورغبت والدین کی آواز پر لبیک کہنے لگیں ،ان کی نصیحت سننے لگیں اور اس پر کان دھرنے لگیں،اور یہ ظاہر ہونے لگے کہ بچہ کی اطاعت اس کے جذبۂ دروں کا نتیجہ، والدین کے حکموں کی تعمیل اس کے قلبی لگاؤ پر مبنی ہے ،کیونکہ محبت و احترام اور جذبۂ صادق کے ساتھ کی جانے والی فرمانبرداری نیز ڈانٹ پھٹکار اور سختی وزبردستی سے کرائی جانے والی اطاعت میں بہت فرق ہے،جس اطاعت پر قلب کی آمادگی ہوتی ہے وہ دائمی،مضبوط اور پائیدار ہوتی ہے،اور جس فرمانبرداری وتعمیل پر جبراً آمادہ کیا جاتا ہے وہ وقتی اور ناپائیدار ہوتی ہے ،شدت اور جبر جیسے جیسے کم ہوتا ہے اسی مقدار میں یہ بھی کم ہوتی جاتی ہے، یا یوں ہوتا ہے کہ جس وقت سختی کا اندیشہ نہیں ہوتا اس وقت تعمیل حکم نہیں ہوتی۔

بعض لوگ اسی طرح سوچتے ہیں کہ اگر وہ اپنے بچوں سے زیادہ گھلیں ملیں گے اور ان کو زیادہ منہ لگائیں گے تو ان کا یہ فعل والدین کے مرتبہ کو اولاد کی نظر میں کم کر دے گا ،اور تربیت کے لئے جس مقام کی ضرورت ہوتی

ہے وہ بچوں کی نظر میں گھٹ جائے گا،لیکن درحقیقت اس فکر کی حیثیت ایک غلطی اور خیالِ محض کی ہے، سچ یہ ہے کہ یہی وہ اچھے اخلاق اور اولاد کی تربیت کا حکیمانہ وکریمانہ اور کامیاب اسلوب ہے جس کی مثال عہد جدید کے اصول تربیت میں بھی ملتی ہے اور جس کی دعوت خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً وعملاً پندرہ صدی قبل دی ہے، چنانچہ حضورؐ عبداللہ وعبیداللہ اور بنی عباس کے بہت سے بچوں کو صف آراستہ کرتے پھر فرماتے ''جو پہلے میرے پاس آجائے گا اس کے لئے ایسا ایسا ہوگا ،تو وہ سب پہلے پہونچنے میں مسابقہ کرتے اور پھر آپؐ کی پشت و سینہ مبارک سے چمٹ جاتے اور آپؐ ان کو بوسے لیتے (۷)امام بخاریؒ نے الأدب المفرد میں اور طبرانی نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے حسنؓ یا حسینؓ کا ہاتھ پکڑا پھر ان کے دونوں پاؤں کو اپنے قدم مبارک پر رکھا ،پھر فرمایا کہ چڑھ جاؤ۔

ظاہر ہے کہ مربیٔ اعظم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرات حسنینؓ کا گود میں اٹھانے اور پشت وکندھوں پر بٹھانے کا جو عمل ہے اور ان کے ساتھ جو مشفقانہ رویہ ہے وہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ آباء واجداد کے لئے ضرب المثل رہا ہے ،لوگ ہمیشہ اپنے بچوں کے ساتھ اسی طرح کے شریفانہ وکریمانہ اخلاق کے ساتھ پیش آتے رہے ہیں خواہ وہ کتنے ہی بڑے سے بڑے مقام ومرتبہ پر فائز ہوں، احمد ونسائی نے شداد سے یہ روایت کی ہے کہ ''حضورؐ نکلے ،اور آپؐ نے حسن یا حسین میں سے کسی کو گود میں اٹھا رکھا تھا، پھر آپ نماز کے لئے آگے بڑھے اور ان کو اتار دیا، آپؐ نے نماز کی تکبیر کہی، پھر آپؐ نے سجدہ کیا اور ایک سجدہ بہت لمبا کر دیا تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا (کہ آخر سجدہ کیوں لمبا ہوگیا) دیکھتا ہوں کہ بچہ آپ کی پشت پر سوار ہے،، میں اپنے سجدہ میں واپس ہوگیا، پھر جب آپؐ نے اپنی نماز پوری کی تو لوگوں نے کہا کہ یا رسول اللہ آپؐ نے سجدہ طویل کر دیا تو آپؐ نے فرمایا کہ میرا بیٹا میرے اوپر سوار ہو گیا تو میں نے یہ گوارہ نہ کیا کہ اس کو جلدی اتار دوں یہاں تک کہ وہ خود ہی اتر جائے (۸)

مسلمان والدین کا اپنے بچوں کے ساتھ یہ سلوک ہونا چاہئے کہ وہ ان کے ساتھ گھل مل کر رہیں، ان کے ساتھ نرمی وشفقت کا معاملہ کریں، ان سے ہلکا پھلکا مذاق کریں اور جس طرح ممکن ہو ان میں رشک و سعادتمندی کا جذبہ پیدا کریں، اس کے لئے جتنی وسعت ہو اور جتنا وقت دینا ممکن ہو دیا جائے، لیکن یہ جذبہ ان میں ضرور پیدا کیا جائے۔

مسلم والدین اپنے بچوں کو اپنی محبت اور اشتیاق کا احساس دلائیں :۔

مسلم والدین کی سب سے واجبی ذمہ داری یہ ہے جو ان پر والدین بننے کے سبب عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اپنی رحمدلی، نرمی وشفقت اور محبت کا احساس دلائیں تاکہ ان کی نفسیات صحیح طریقہ پر پروان چڑھے اور ان کے دلوں میں

اعتماد پیدا ہوا اور ان کے دل صاف اور محبت سے معمور ہوں۔

ظاہر ہے کہ رحمدلی اسلامی اخلاق کا بنیادی حصہ ہے اور یہ آپؐ کے اخلاق کریمانہ اور آپ کی مثالی اور پاکیزہ عادتوں کا اہم عنصر ہے، حضرت انسؓ کی روایت ہے، فرماتے ہیں: کہ میں نے کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر عیال پر رحم کرنے والا نہیں دیکھا، فرماتے ہیں: کہ ایام رضاعت میں آپؐ کے صاحبزادہ ابراہیم مدینہ کی بالائی بستیوں میں رہتے تھے تو وہاں آپؐ چل کر جایا کرتے تھے اور ہم آپؐ کے ساتھ ہوتے تھے، آپؐ گھر میں داخل ہوتے تھے، ان کو گود میں لیتے تھے ان کو بوسہ دیتے تھے پھر واپس آتے تھے (۹)

حضور اکرمؐ کی رحمت کا یہ حال تھا کہ آپؐ بالکل نوخیز اور چھوٹے چھوٹے بچوں پر بھی رحمت و شفقت فرماتے اور کھیلتے ہوئے بچوں کو بھی اپنے آغوش رحمت میں لیتے ان پر شفقت فرماتے اور انھیں پیار سے چمٹا لیتے جیسا کہ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرمؐ جب بھی بچوں کے پاس سے گذرتے تو (انھیں دیکھ) کر مسکراتے اور ان کو سلام کرتے (۱۰)۔

آپؐ کے تربیتی اقوال میں سے یہ قول ہمیشہ ملحوظ رکھنے کے لائق ہے "لیس منا من لم یر حم صغیرنا ویعرف کبیرنا" (۱۱) وہ ہم میں سے نہیں ہے جو چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کا حق نہ پہچانے،

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے حضرت حسن کو بوسہ لیا تو اقرع بن حابس نے کہا کہ میرے دس بچے ہیں میں نے ان میں سے کبھی کسی کو بوسہ نہیں لیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا (۱۲)

مربی اعظم رسول کریمؐ ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ لوگوں کو رحمدلی و نرمی کا اس قدر عادی بنا دیں کہ جذبۂ رحم ان میں ایک چشمہ کی طرح پھوٹ پڑے، اور اپنے اندر کی باتوں کو محض شفقت و محبت کے سبب بیان کر دیں، یہی چیز انسان کی خصوصیات میں سب سے خاص ہے، ایک دن آپؐ کے پاس ایک اعرابی آیا اور اس نے آپؐ سے سوال کیا کہ آپ لوگ اپنے بچوں کو بوسہ لیتے ہیں، ہم لوگ تو بوسہ نہیں لیتے تو آپؐ نے فرمایا کہ میں کیا کروں جب کہ اللہ تعالی نے تمہارے دل سے رحم کو سلب کر لیا ہے (۱۳)

ام المؤمنین سیدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ حضرت فاطمہؓ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتیں تو آپؐ کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے اور ان کو بوسہ دیتے اور ان کو اپنے ساتھ بٹھاتے، اور جب آپؐ ان کے پاس تشریف لے جاتے تو آپ کا ہاتھ پکڑ لیتیں اس کو بوسہ دیتیں اور آپؐ کا ستقبال کرتیں اور آپؐ کو اپنے ساتھ بٹھاتیں، جب آپؐ کے پاس وہ مرض الموت میں حاضر ہوئیں تب بھی آپؐ نے ان کا استقبال کیا اور ان کو بوسہ دیا (۱۴)

ایک سچا مسلم ان جامع و بلند تر و بالا نبوی

ارشادات وتعلیمات کو پڑھ لینے اور جان لینے کے بعد اپنی اولاد کے ساتھ تُرش روئی نہیں کرسکتا، ان کے ساتھ معاملات میں روکھا پن اور انکو مخاطب کرنے میں سختی سے نہیں پیش آسکتا، اگرچہ اس کے مزاج میں کچھ سختی اور اخلاق کچھ روکھے ہوں، یہ سوچنا چاہئے کہ یہ دین جس کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، واضح اور روشن ہدایات پر مشتمل ہے، وہ دل کو نرم کرتا ہے، اس سے محبت کے سوتے پھوٹتے ہیں، وہ دین محبت کے جذبات پیدا کرتا ہے، ظاہر ہے کہ ان تعلیمات وہدایات کی روشنی میں اولاد کے ساتھ تو یقیناً محبت وشفقت کا معاملہ زیادہ ہونا چاہئے کہ اولادیں تو جگر کے ٹکڑے ہوتی ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:۔

وانما اولادنا بیننـــــــــــا
أکبادنا تمشی علی الأرض
وا ن هبت الریح علی بعضهم
تمتنع العین من الغمــض

''ہماری اولادیں تو جگر کے ٹکڑے ہیں جو ہمارے درمیان زمین پر چلتے پھرتے ہیں، اگر ان میں سے کسی کو ہوا کا جھونکا لگ جائے تو آنکھ بھی نہیں جھپکتی''

لہٰذا والدین کو محبت وشفقت کا پتلہ، رحمدلی اور مروت ورعایت کے جذبہ سے ہروقت معمور رہنا چاہئے اور ہمہ وقت قربانی دینا ان کا شیوہ ہونا چاہئے۔

مسلم والدین کو اولاد پر سخاوت و خوشی کے ساتھ خرچ کرنا چاهئے :۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام صرف یہ کافی نہیں سمجھتا کہ والدین اولاد کے ساتھ صرف فطری نرمی وشفقت کا معاملہ کریں اور اسی کو کافی سمجھیں، یہ فطری لگاؤ اور طبعی محبت تو اس لئے ہے کہ جب کبھی زندگی میں کوئی ایسا موڑ آجائے کہ والدین یا دونوں میں سے کوئی ایک بچے سے غافل ہو جائے، خوشگوار زندگی کی تشکیل میں قربانی کا جذبہ پھیکا پڑنے لگے، زندگی تلخ وتنگ ہونے لگے، فقر کا غلبہ ہو جائے اور والدین خرچ کرنے کو مصیبت سمجھنے لگیں اور اس کی ضروریات کو بوجھ سمجھنے لگیں تو یہ فطری جذبۂ محبت آڑے آجائے، اسلام کی نظر میں یہ فطری جذبہ بھی عظیم ثواب کا باعث ہے، اس جذبہ کے سامنے قربانیاں بھی پھیکی پڑ جاتی ہیں، یہ جذبہ بڑی سے بڑی مصیبت کو بھی ہیچ کر دیتا ہے اور رزق کی تنگی کو بھی خوشحالی اور توسع میں تبدیل کر دیتا ہے۔

حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: کہ یارسول اللہ! کیا اگر میں بنی سلمہ پر خرچ کروں تو اس پر اجر ملے گا، میں ان کو اس حال میں چھوڑنا نہیں چاہتی اس لئے کہ وہ میرے بچے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ ہاں تم ان پر جو بھی خرچ کروگی تم کو اس کا ثواب ملے گا۔(۱۵)

حضرت ابومسعودؓ نبی کریمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ جب کوئی آدمی اپنے اہل وعیال پر ثواب کی نیت سے خرچ کرتا ہے تو یہ اس کے لئے صدقہ

بن جاتا ہے(۱۶)

اس کو اسلام کی خوبی کہیے اور اس کا احسان مانیئے کہ اللہ تعالی نے اہل وعیال پر خرچ کرنے کو مال خرچ کرنے کا افضل ترین مصرف قرار دیا ہے، امام مسلمؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ وہ دینار جس کو تم نے اللہ کے راستے میں خرچ کیا اور وہ دینار جس کو غلام آزاد کرانے میں خرچ کیا اور وہ دینار جس کو مسکین پر خرچ کیا اور وہ دینار جس کو اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا ان میں اجر کے اعتبار سے وہ دینار زیادہ افضل ہے جس کو تم نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا!

مسلم کی ایک اور روایت میں اس طرح ہے کہ سب سے افضل دینار وہ ہے جس کو کوئی شخص اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے اور وہ دینار جس کو کوئی شخص اللہ کے راستے میں اپنی سواری پر خرچ کرتا ہے اور وہ دینار جس کو کوئی شخص اللہ کے راستے میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرتا ہے۔

سچے اور حق پرست مسلم کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ اس کو اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے سے خوشی ہوتی ہے اور وہ سکون محسوس کرتا ہے، اور اس کو اپنی سعادت وخوش قسمتی تصور کرتا ہے، جب کہ اس کو اس بات کا پختہ یقین ہو کہ وہ اپنے اہل وعیال پر جو کچھ خرچ کرتا ہے، وہ محض اللہ کی رضا کے لئے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے اجر کو دوبالا کر دیتا ہے، اللہ کی رحمت کا تو یہ عالم ہے کہ بندہ اگر خوشی کے ساتھ، محبت کے جذبہ سے اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ رکھے تو اللہ نے اس میں بھی اس کے لیے اجر رکھا ہے، حضرت سعد بن وقاصؓ کی یہ روایت اس کی تائید وتصدیق کرتی ہے جس میں اللہ کے رسولؐ نے ان سے فرمایا ''کہ تم جو بھی مال اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے خرچ کرتے ہو اس پر تم کو اجر دیا جاتا ہے حتی کہ تم اپنی بیوی کے منہ میں جو (لقمہ) رکھتے ہو (اس پر بھی تم کو اجر ملتا ہے) (۱۷)

ایک سچے مسلمان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ حضورؐ کا یہ تہدید آمیز فرمان سنے اور پھر بھی اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے غفلت برتے، آپؐ نے فرمایا کفی بالمرء إثما أن يضيع من يقوت" (۱۸) آدمی کے گناہگار ہونے کے لئے کافی ہے کہ وہ اس کے رزق کا انتظام نہ کرے جس کی ذمہ داری اس کو سونپی گئی ہے''۔ اس ارشاد نبوی کے سامنے آجانے کے بعد ایک سچے مسلمان کے لئے یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کو فقر و فاقہ میں چھوڑے رکھے اور ان کی زندگی تنگی میں بسر ہو، اگر کوئی ان گھریلو واجبات سے پہلو تہی کرتا ہے تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اس کو رسول اللہؐ نے سخت قسم کا گناہ قرار دیا ہے اور اس کے برے انجام کی طرف اشارہ کیا ہے،

سچا مسلمان محبت و نفقہ میں بیٹے اور بیٹیوں کی تفریق نہیں کرتا:

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بیٹیوں کے لئے اپنا ہاتھ تنگ کر لیتے ہیں اور ان کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ

کاش اللہ تعالیٰ ان کو صرف بیٹے ہی دیتا، حالانکہ یہ بے چارے اس والد کی عظمت اور اس کے لئے اللہ کی طرف سے متعین کیے گئے ثواب و اجر عظیم سے واقف ہی نہیں جس کو اللہ نے بیٹیوں سے نوازا ہو، اگر یہ ناواقف لوگ اس اجر کو جان لیں جو اس نیک شخص کو ملے گا جو بیٹیوں کی کفالت کرتا ہو تو اس پر رشک کرنے لگیں اور یہ خواہش کریں کہ کاش ان کو بھی صرف بیٹیاں ہی عطا کی جائیں،

رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ ''جس کی تین بیٹیاں ہوں، وہ ان پر صبر کرے، اور ان کو اچھے طریقہ سے کھلائے، پلائے اور پہنائے تو قیامت کے دن وہ بیٹیاں اس کے لئے جہنم سے حجاب بن جائیں گی،'' رسول کریمؐ کے ذریعہ دی گئی اجر وثواب کی اس بشارت کو سن کر وہ کون سا مسلمان ہے جو بیٹیوں کی تعلیم و تربیت اور ان پر خرچ کرنے میں توقف کرے گا،

اسلام دستور حیات ہے، وہ دین فطرت اور انسانی زندگی سے ہم آہنگ دین ہے اسی لیے وہ انسانی زندگی کی مشکلات اور حقائق کا لحاظ کرتا ہے اور اس کے حل پیش کرتا ہے، ایک باپ جو پہلے سے ہی قلیل آمدنی یا کثرت اولاد کے سبب فقر وتنگی میں مبتلا ہو اگر اس کی کسی بیٹی کو طلاق کے بعد پھر اس کے گھر واپس کر دیا جائے تو اس کے غم، فکر اور گویا اس پر ٹوٹنے والی مصیبت کا ذرا اندازہ کیجئے، لیکن قربان جانے کے لائق ہے یہ دین جس نے اس کا بھی خوبصورت حل یوں پیش کیا کہ جو بیٹی طلاق کے سبب پھر اپنے والد کی کفالت میں آجائے اس پر خرچ کرنے کو اسلام نے سب سے بڑا صدقہ اور اللہ کے یہاں سب سے زیادہ پسندیدہ قرار دیا، حضور اکرمؐ نے سراقہ بن جعشم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''کیا میں تم کو سب سے افضل صدقہ یا افضل صدقات میں سے ایک نہ بتادوں، انہوں نے عرض کیا کیوں نہیں یارسول اللہ، آپؐ نے فرمایا کہ تمہاری وہ بیٹی جو تم کو لوٹا دی گئی ہو اور تمہارے علاوہ کوئی اس کے لئے کمانے والا نہ ہو'' (۱۹)

مغرب کی مادی اور مادیت پسند زندگی کی تلخیاں اور سختیاں اسلام کی عطا کردہ اس خانگی محبت وشفقت کا مقابلہ کہاں کر سکتی ہیں، دونوں کا موازنہ ہی فضول ہے، مغرب میں بیٹی ہو یا بیٹا! ۸ سال کی عمر مکمل کرتے ہی وہ والدین کی آغوش تربیت ومحبت سے نکل جاتا ہے اور پھر وہ مادیت کی سختیوں کا سامنا کرتا ہے اور کمانے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں، انہیں برداشت کرتا ہے، ایسی صورت میں کسی بیٹی کی واپسی کس قدر دشوار ہوگی اور اس کے لئے گھریلو چشمۂ محبت سے فیضیاب ہونا کس قدر مشکل ہوگا، اللہ تعالیٰ کی شریعت اور قاصر انسانوں کی بنائی ہوئی تہذیب کے درمیان یہ بہت نمایاں فرق ہے، چنانچہ اگر مغرب میں بھٹکتے ہوئے بیکار سرگرداں وحیراں نوجوانوں کی بھیڑ ملے اور برباد ہوتی دوشیزائیں نظر آئیں، غیر شادی شدہ لڑکیاں جو اپنی لغزش اور مغربی تہذیب کے مکر وفریب کے باعث ماں بن گئی ہوں، بھٹکتی پھرتی نظر آئیں تو اس پر کوئی تعجب و

حیرانی نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کو مادیت پسندوں کی مادی نقطۂ نظر سے کی گئی قانون سازی کا نتیجہ اور انسانوں کے ذریعہ برپا کی گئی تہذیب کا وبال سمجھنا چاہیے، ایسے نوجوانوں اور دوشیزاؤں کی تعداد میں گردش زمانہ کے ساتھ مغرب میں روزافزوں اضافہ ہورہا ہے۔

اولاد کی تربیت میں مؤثر چیزوں پر والدین کی نظر:

مسلمان والدین بیدار رہتے ہیں اور ہر وقت ان کی نظر اولاد پر رہتی ہے، ان کے بچے جو کچھ پڑھتے، لکھتے ہیں اس سے واقف ہوتے ہیں، جن مشاغل سے ان کو محبت ہوتی ہے وہ بھی ان کے علم میں ہوتے ہیں، اور وہ مشغلے بھی والدین جانتے ہیں یا جو وہ اولاد میں اس طرح پیدا کردیتے ہیں کہ اولاد کو محسوس بھی نہیں ہوتا، بچوں کے دوست جن کی صحبت میں وہ رہتے ہیں یا زیادہ تر اوقات جن کے ساتھ وہ گزارتے ہیں اور وہ خاص خاص جگہیں جہاں خالی اوقات میں بچے جانا پسند کرتے ہیں، والدین کی نظر سب پر رہتی ہے، اور اس طرح رہتی ہے کہ بچوں کو خبر بھی نہیں ہو پاتی کہ والدین ان کی نگرانی کررہے ہیں، اسی لیے جیسے ہی بچے کسی چیز سے انحراف کرتے ہیں خواہ مطالعہ میں یا دلچسپی کے مشاغل میں یا کسی برے دوست کا ساتھ پکڑتے ہیں یا کسی مشکوک جگہ پر جاتے ہیں یا کوئی بری لت لگتی ہے، مثلاً سگریٹ نوشی یا مکروہ وحرام کھیل وغیرہ جن سے ضیاع وقت ہو اور طاقت برباد ہو نیز بچے کھیل کود اور خالی رہنے کے عادی ہونے لگیں تو فوراً ہی وہ اس کو تنبیہ کرتے ہیں اور حکمت ونرمی اور دانائی کے ساتھ ان کو صحیح حالت میں واپس لاتے ہیں، انتہائی ذہانت ودانشمندی اور کوشش کے ساتھ ان کی صحیح رہنمائی کرتے ہیں۔

ایک صحیح حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بچہ اپنی فطرت کے ساتھ دنیا میں پیدا ہوتا ہے پھر اس کو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنانے کا کام اس کے والدین کرتے ہیں، یعنی بچہ جس راہ کو پکڑ کر آئندہ زندگی کا سفر طے کرتا ہے وہ والدین کی دکھائی ہوئی ہوتی ہے وہ جس طرح چاہتے ہیں اس کے کردار وشخصیت اور اخلاق کی تعمیر کرتے ہیں، مذکورہ بالا تربیتی عناصر کے مطالعہ سے یہ بات اور پختہ ہوجاتی ہے کہ بچہ کی عقل وشخصیت کی تشکیل اور اس کی تربیت کی ذمہ داری والدین پر ہے وہ جس رنگ میں چاہیں اسے رنگ دیں۔

اس لئے یہ ضروری ہے کہ بچے جو کتاب پڑھیں وہ ان کے ذہن کی گرہوں کو کھولنے والی، اچھے اخلاق کو ان میں جنم دینے والی اور ان کی شخصیت کو اعلیٰ اقدار سے آراستہ کرنے والی ہو، ایسی نہ ہو کہ اس کا مطالعہ بچوں کی عقل کو الجھنوں میں پھنسادے، ان کی فطرت میں فساد پیدا کردے اور ان کے دلوں میں موجود خیر کی چنگاریوں کو بجھادے۔

ان کے محبوب پسندیدہ مشغلے ایسے ہوں کہ وہ ان میں خیر کے پہلوؤں کو جنم دے سکیں اور ان سے شر جنم نہ لینے پائے، وہ باطل کے بجائے حق کی چنگاریوں کو بھڑکانے والے ہوں، ان کے سبب بچوں میں مریض ذوق

کے بجائے ذوق سلیم پیدا ہو سکے۔

دوست ایسا ہونا چاہیے کہ وہ جنت کی طرف رہنمائی کرے نہ کہ جہنم کی طرف، باطل کے بجائے حق کی طرف رہنمائی کرے، وہ فساد، گھٹیا اور رذالتوں کے بجائے رشد و ہدایت بلندی اور کامیابی کی طرف لے جانے والا ہو چنانچہ مشاہدے کی بات ہے کہ بسا اوقات والدین کو پتہ بھی نہیں چلتا اور بچے اپنے دوستوں کی وجہ سے برائیوں کی راہ پر پڑ جاتے ہیں اور رذیل عادات کا شکار ہو جاتے ہیں، عدی بن حاتم نے دوستی کی بابت بڑا حکیمانہ شعر کہا ہے:

إذا كنت في قوم فصاحب خيارهم
ولا تصحب الأردى فتردى مع الردى
عن المرء لا تسأل وسل عن قرينه
فكل قرين بالمقارن يقتدى

''جب تم لوگوں کے درمیان رہو تو ان میں سے چیدہ افراد کو دوست بناؤ، گھٹیا لوگوں کو دوست نہ بناؤ کیونکہ گھٹیا لوگوں کی دوستی سے تم بھی گھٹیا شمار ہو گے، جب کسی شخص کے بارے میں معلوم کرنا ہو (کہ وہ کیسے اخلاق و کردار کا حامل ہے) تو اس کے دوست کا حال معلوم کرو، اس لئے کہ ہر دوست اپنے دوست کی اقتدا کرتا ہے''

تو اس طرح سے بیدار مسلم والدین اپنے بچوں کی تربیت پر توجہ دیتے ہیں، وہ ان کی کتاب، میگزین، دوست، مشغلے، مدرسہ و اساتذہ اور مجالس و ذرائع ابلاغ وغیرہ پر پوری طرح نظر رکھتے ہیں، اسی طرح ہر اس چیز پر ان کی توجہ رہتی ہے جس کی پابندی کرنے سے بچوں کی شخصیت کی تعمیر اور عقل کی تشکیل اور عقیدے کی پختگی اور نفس کی تربیت پر مثبت یا منفی اثر پڑ سکتا ہو، اور یہ توجہ اس لئے کرنی پڑتی ہے تاکہ بچوں کی تربیت میں کوئی لغزش نہ ہو اور بچے کسی دشواری یا مرض یا بری عادت کا شکار نہ ہو جائیں،

چنانچہ جو گھرانے اپنے بچوں کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہیں اور اس پر توجہ کرتے ہیں بلکہ ان کی تربیت کو ترجیح دیتے ہیں تو وہ کامیاب ہوتے ہیں اور ان کے بچے خود ان کے لئے معاشرہ اور قوم کیے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں، اس کے برعکس جو گھرانے اپنی اس عظیم ذمہ داری سے غفلت برتتے ہیں یا اس میں سستی کرتے ہیں تو ان کے بچے ان کے لئے اور معاشرے کے لئے فساد بن جاتے ہیں اور ایسی مصیبت بنتے ہیں جو نہ دنیاوی زندگی میں پیچھا چھوڑتی ہے اور نہ مرنے کے بعد، آخر اللہ تعالیٰ نے سچ ہی تو فرمایا ہے ان من ازواجكم واولادكم عدو لكم فاحذروهم (۲۰) ''بے شک تمہاری اولاد اور تمہاری بعض بیویاں تمہارے دین کی دشمن ہیں تو تم ان سے بچتے رہو''۔

ظاہر ہے کہ اگر والدین اپنے بچوں کی صحیح منہج پر تربیت کریں اور اپنی اس واجبی ذمہ داری کا بھرپور حق ادا کریں تو ان کے بچے ان کے دشمن نہ ثابت ہوں گے۔

مسلم والدین اپنی اولاد میں

مساوات برتتے ہیں:

تربیت کے حکیمانہ طریقوں کا ایک رہنما اصول یہ بھی ہے کہ بچوں کے درمیان مساوات برتی جائے، تمام معاملات میں ان کے درمیان برابری ملحوظ رکھی جائے، اس لیے کہ جب بچے اپنے درمیان عدل ومساوات کا مشاہدہ کریں گے تو ان میں صحیح نفسیات جنم لیں گی اور وہ نقائص سے مبّرا ہوں گے، اپنے بھائیوں کے سلسلہ میں کسی طرح کے حسد کا شکار نہ ہوں گے حتی کہ ان کو اپنے بھائیوں پر غیرت بھی نہ آئے گی بلکہ ان میں رضامندی، درگزر، ایثار، حسن سلوک اور دوسروں کی محبت کا جذبہ جنم لے گا، اور یہی وہ خصوصیات و عادات ہیں جن کی اسلام نے ترغیب دی ہے اور والدین کو اس کا حکم دیا ہے۔

امام بخاریؒ و امام مسلمؒ حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت کرتے ہیں: کہ ان کے والد ان کو لیکر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: میں نے اپنے اس بیٹے کو اپنا ایک غلام عطیہ میں دیا ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے ایسے ہی اپنے سب بیٹوں کو غلام دیا ہے، تو حضرت نعمانؓ نے نفی میں جواب دیا، تو رسولؐ ارشاد فرمایا اس کو واپس لے لو۔

ایک روایت میں ہیکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ کیا تم نے اپنے تمام بیٹوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں، آپؐ نے ارشاد فرمایا، اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف کرو، تو میرے والد واپس آئے اور وہ صدقہ واپس لے لیا،

ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: کہ اے بشر! کیا تمہارے پاس اس کے علاوہ بھی کوئی بیٹا ہے، انہوں نے کہا: ہاں! آپؐ نے ارشاد فرمایا: کیا تم نے ایسے ہی سب کو ھبہ کیا ہے، انہوں نے کہا: نہیں! آپؐ نے فرمایا: تو تم میری گواہی نہ طلب کرنا، میں زیادتی پر گواہی نہ دوں گا، پھر فرمایا: کیا اگر یہ سب تمہارے ساتھ حسن سلوک کرنے میں برابر ہوں تو تم کو خوشی ہوگی؟ انہوں نے کہا، کیوں نہیں، آپؐ نے فرمایا: تو اب یہ مت کرنا (۲۱)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ متقی والدین کو اپنی اولاد کے درمیان عدل ومساوات کا پابند ہونا چاہیے، وہ کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیں، خواہ ہبہ وعطیہ کی بات ہو یا معاملات ونفقات کی، ان کے لئے ساری اولاد برابر ہیں، اور یہ وہ طریقہ ہے جس کی پابندی کے سبب سب بچوں کی زبانیں یکساں طور پر اپنے والدین کے لئے خیر وعافیت کی دعاؤں میں تر رہتی ہیں اور سب کے دلوں میں والدین کے تئیں ایک ہی طرح کی تعظیم وتوقیر اور ان کا رعب وادب رہتا ہے۔

مسلم والدین اپنے بچوں میں اعلیٰ اخلاق پیدا کرتے ہیں:

خوش دلی، رضامندی اور قناعت وحسن سلوک جیسی پاکیزہ اور مؤثر عادات کا سہارا لے کر مسلم والدین اپنی اولاد کو اعلیٰ انسانی اقدار سے آراستہ اور مکارم اخلاق سے مزین کر سکتے ہیں، ان کو ایسے اخلاق کا عادی بنا سکتے

ہیں جو مثالی، انسانی اور اسلامی ہونے کے ساتھ اعلیٰ اقدار کے عکاس اور پرکشش ہوں، مثلاً دوسروں سے محبت کا جذبہ، کمزوروں سے ہمدردی، صلہ رحمی، بڑوں کا ادب و احترام، چھوٹوں پر شفقت، اچھے کام کرنا، لوگوں میں انصاف کو عام کرنا اور اس جیسی دوسری اچھی عادتیں ان میں پیدا کرکے انہیں اخلاق و کردار کی بلندیاں عطا کی جاسکتی ہیں، یہ کام والدین ہی انجام دے سکتے ہیں کیوں کہ تربیت کی ذمہ داری ان ہی پر ہے، اور خیر کا وجود بھی وہیں سے ہوسکتا ہے جہاں سے آدمی فیضیاب ہو، البتہ اگر والدین خود ان اوصاف سے خالی ہوں گے یا اس سمت توجہ نہ کریں گے تو بچوں کا بھی ان اخلاق سے عاری ہونا طے ہے اسلئے کہ جس کے پاس کچھ ہوگا ہی نہیں وہ دوسروں کو کہاں سے دے گا، کہنے والے نے بجا کہا ہے کہ! ''صلاح وتقویٰ اللہ کی توفیق سے ملتا ہے لیکن ادب والدین سے ہی ملنا ممکن ہے''۔(۲۲)

دانشمند مسلم والدین جانتے ہیں کہ بچوں کے دل میں کیسے اپنا مقام پیدا کیا جائے اور ان میں حکمت و طاقتور اور مؤثر اخلاق کیسے پیدا کیے جائیں، اس کے لئے وہ حکیمانہ تربیتی اصولوں کا سہارا لیتے ہیں، اعلی اور محبوب ترین نمونہ کو سامنے رکھتے ہیں، فرح و بسط، میل جول، رحمدلی وتواضع، خوش دلی، محبت وزائد اہتمام، حوصلہ جوئی، نرمی اور عدل و مساوات، نصیحت وتنبیہ اور توجیہ و ہدایت جیسے عناصر کا استعمال کرتے ہیں، اور ایسی نرمی کرتے ہیں جو کمزوری سے خالی ہو، اور ایسی سختی کرتے ہیں جو سخت دلی سے خالی ہو، اس طرح سے وہ اپنے بچوں کی پرورش حسن سلوک، رعایت وتوجہ اور محبت کے ماحول میں کرتے ہیں اور اسی طرح کے ماحول میں ایسے بچے پروان چڑھ سکتے ہیں جو صالح، وفادار، نیک، متوازن شخصیت کے حامل، کھلے ذہن کے مالک، کچھ دینے پر قادر اور ذمہ داریاں اٹھانے کے اہل ہوں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر خاندان ایسی تربیت کے لئے مبادی اسلام سے آشنا و آراستہ اور قرآنی تعلیمات سے مزین ہو، اللہ تعالیٰ نے بجا فرمایا ہے صبغة الله ومن احسن من الله صبغة (۲۳) ''اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اللہ کے رنگ سے خوبصورت کس کا رنگ ہوسکتا ہے''۔

☆☆☆

حواشی

(۱) سورہ کہف ۴۶ (۲) بخاری ومسلم (۳) سورہ تحریم ۶
(۴) متفق علیہ (۵) الادب المفرد، مؤطا، مسند احمد
(۶) مسند احمد، ابوداؤد، مستدرک حاکم (۷) مسند احمد، تہذیب ۴۲۱/۸ (۸) مسند احمد، سنن نسائی (۹) مسلم
(۱۰) متفق علیہ (۱۱) مسند احمد، مستدرک حاکم
(۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷) متفق علیہ (۱۸) مسلم، ابوداؤد
(۱۹) مسند احمد (۲۰) سورہ التغابن ۱۵ (۲۱) متفق علیہ
(۲۲) الادب المفرد (۲۳) سورہ بقرہ ۱۳۸

☆☆☆

تعلیم وتربیت

مثالی استاذ

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔اس حدیث سے تعلیم اور معلم کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم ایک پیغمبرانہ عمل ہے،تعلیمی ادارہ کوئی بھی ہو، مدرسہ ہو، اسکول یا کالج ہو، اکیڈمی یا یونیورسٹی ہو، وہ اصلا مردم سازی کی کارگاہ بھی ہے، جہاں فاضلانہ اخلاق والی شخصیتیں ڈھلتی ہیں، یہاں عقل سلیم اور فکر مستقیم والے انسان بنائے جاتے ہیں،تعلیم فرد اور جماعت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ہے،تعلیم آدمی کو بہتر انسان بنانے کے لئے دی جاتی ہے،ایسا انسان بنانے کے لئے جو منصف مزاج ہو،حق گو اور حق شناس ہو اور جملہ محاسن اخلاق کا نمونہ ہو۔

پیغمبر ﷺ نے صرف یہ نہیں فرمایا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں بلکہ یہ بھی فرمایا کہ میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں، ان دونوں حدیثوں سے یہ معلوم ہوا کہ تعلیم اور اخلاق کے درمیان گہرا رشتہ ہے۔اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ایک معلم کو مکارم اخلاق کا نمونہ ہونا چاہئے۔اگر وہ اپنی گفتار اور کردار سے خود کو اس کا اہل ثابت نہ کر سکے تو وہ اس منصب جلیل پر فائز ہونے کے لائق نہیں کیونکہ اچھا معلم اور اچھا استاذ وہ ہے اخلاقی اعتبار سے جس کا فائدہ عام ہو۔اور جس کا فیض فیضِ مدام ہو۔

تعلیم دراصل نام ہے کسی قوم کی روحانی اور تہذیبی قدروں کو نئی نسل تک اس طرح پہونچانے کا کہ وہ اس کی زندگی کا جز بن جائے۔یعنی اچھے استاذ کا کام ہے کہ طالب علموں میں انصاف،حق پسندی، انسانیت کے لئے احترام، باہمی رواداری، محنت و جفاکشی کی خصلتیں پیدا کرے، جو استاد طالب علموں میں تہذیبی نفاست اور اخلاقی شرافت پیدا نہیں کرتا وہ اچھا استاذ نہیں۔تعلیم دراصل مثبت اقدار کی پرورش اور منفی رجحانات سے طلبہ کو بچانے کا نام ہے۔

بڑی غلط فہمی ہے کہ تعلیم کا مطلب صرف کسی مضمون یا مواد کو پڑھا دینا اور سمجھا دینا ہے، بلکہ تدریس کے ساتھ طالب علم کے دل و دماغ پر اخلاق اور سیرتِ

انسانی کا دیرپا اور پائیدار نقش قائم کرنا ہے، آج اگر ملک میں بگاڑ ہے اور سماجی خرابیاں پائی جاتی ہیں تو اس کی ذمہ داری جہاں سیاست دانوں اور پالیسی ساز حکمرانوں کے سر پر جاتی ہے وہاں اساتذہ بھی اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ مادی اقتدار کے ساتھ روحانی اور اخلاقی اقدار کا توازن قائم رکھنا اور اس کے مطابق طالب علم کی شخصیت کو متوازن بنانا ایک استاذ کی اصل ذمہ داری ہے۔ اس کی تربیت سے ایسے طالب علم تیار ہونے چاہئیں۔ جو باصلاحیت ہونے کے ساتھ ماحول پر اثر انداز ہوں اور سماجی برائیوں کو دور کر سکیں۔

تعلیم چونکہ اصلا ایک ذہنی، اخلاقی اور جمالیاتی عمل ہے اس لئے کسی مضمون، علم، فن یا زبان کی تدریس ہو اچھے استاذ کا کام یہ ہے کہ وہ اخلاقی قدروں پر بھی زور دے کیونکہ تعلیم گاہ وہ کارگاہ ہوتی ہے جہاں علم اور اخلاق کی شخصیتیں ڈھالی جاتی ہیں وہاں صرف کتاب نہیں پڑھائی جاتی بلکہ طالب علم کی شخصیت کی مکمل نشوونما کی فکر کی جاتی ہے، ایسی تعلیم گاہ کا اچھا استاذ وہ ہوتا ہے جو طالب علم کی پوشیدہ صلاحیت کو اجاگر کرے، صرف کتاب نہیں پڑھائے بلکہ طالب علم کو منصف مزاج، راست باز حق گو و دیانت دار اور انسانیت دوست اور اچھا شہری بنائے، اس میں وضع داری اور احساسِ ذمہ داری پیدا کرے، اس میں دوسروں کی خدمت کا شوق اور برائیوں سے نفرت کا جذبہ پیدا کرے، اس کے جذبۂ تحقیق اور تجسس کو ابھارے اور گفتگو، تحریر اور تقریر کی مشق کے لئے ماحول کو سازگار بنائے۔ روحانی، اخلاقی اور تہذیبی قدریں اگر نئی نسلوں تک نہیں پہونچائی جاسکیں تو ملک اور سماج کے مستقبل کو روشن نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ اچھے استاذ کو چاہیے کہ وہ طالب علموں کے ذہن میں ''ہے'' اور ''چاہیے'' کے درمیان فرق اور امتیاز پیدا کرے تاکہ یہ احساس طلبہ کے ذہن میں راسخ ہو کہ برائیوں کو ختم کرنے اور اچھائیوں کو عام کرنے کے لئے اس کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔ اسے گفتار کا غازی نہیں بلکہ کردار کا غازی بننا ہے اور تعلیمی کاموں کا رجحان پیدا کرنا ہے۔

طالب علم کی حیثیت نرسری کے ایک پودے کی ہے، حیاتِ انسانی کا یہ پودا تعلیم گاہ کی نموبخش فضاء میں پرورش پاتا ہے، اس پودے کی آبیاری اور دیکھ بھال کا کام ایک اچھا استاذ انجام دیتا ہے۔ ایک اچھے استاذ کے بغیر طالب علم کی شخصیت برگ و بار نہیں لاتی ہے۔ طالب علم کی زندگی کے ساز کو استاذ کی زندگی کے مضراب کی ضرورت ہوتی ہے۔ استاذ کی رہنمائی اور شفقت کی حیات بخش شبنم سے طالب علم کا غنچۂ حیات شگفتہ ہوتا ہے اور اس کے بغیر یہ غنچہ مرجھا جاتا ہے۔ طالب علم کی حیثیت مس خام کی ہوتی ہے اور استاذ کی کیمیاء اثر صحبت سے وہ کندن بن جاتا ہے۔

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ کسی بھی تعلیمی ادارہ کا مقصد درسیات پڑھا کر امتحان دلانا نہیں ہوتا

ہے یہ چیز تو اصل مقصد کا محض ایک ذریعہ ہے، تعلیم گاہ کی شاندار عمارت ، کلاس روم کا خوبصورت فرنیچر، عالیشان لائبریری، کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں اگر ایک اچھے استاذ کا طلبہ کے درمیان اخلاقی ماڈل موجود نہیں، استاذ کی رہنمائی میں طالب علم کو اچھے اور برے کی تمیز حاصل کرنا چاہیے، اس کے مطالعہ کو سماجی مسائل سے مربوط بھی ہونا چاہیے، اس کے اندر حالات کو سمجھنے اور ان کی تحلیل اور تجزیہ کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے، اسے ایک باعمل انسان بھی ہونا چاہیے، اس کے دل میں خدا کا خوف اور خلق خدا سے محبت بھی ہونی چاہیے، طالب علم کی تربیت اس انداز سے ہونی چاہیے کہ وہ آگے چل کر اقدار عالیہ کا شارح، مبلغ اور ترجمان بن سکے اور سماجی برائیوں اور دشواریوں کو دور کر سکے اگر کوئی طالب علم امتحان میں کامیاب ہوگیا اور اس نے ڈگری لے لی لیکن اس کی شخصیت اخلاق وتہذیب کے نور سے منور نہیں ہوسکی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد حاصل نہ ہوسکا، کیونکہ تعلیم تو شخصیت کو فروغ دینے اور اچھا انسان بنانے کے لئے دی جاتی ہے، ایسا طالب علم امتحان میں کامیاب ہونے کے باوجود زندگی کے امتحان میں ناکام ہے کیونکہ اسے ایسا اچھا استاذ نہیں مل سکا جو اپنی شخصیت کے چراغ سے اس چراغ کو روشن کر سکے جو اپنی کیمیا گری سے اسے کندن بنا سکے۔ ایک اچھا استاذ ایک نبض شناس حکیم کے مانند ہوتا ہے، تعلیم گاہ کا استاذ ایک دانشور مفکر مقرر مصنف اور مضمون نگار کی حیثیت سے معاشرہ کی بیماریوں کا طبیب حاذق ہوتا ہے، اپنے بلند منصب کے اعتبار سے جسمانی امراض کے معالج سے اسے اونچا درجہ حاصل ہے، تعلیم گاہ کا استاذ سماج کی تعمیر کا انجینئر بھی ہوتا ہے اپنے منصب اور ذمہ داری کے اعتبار سے سمنٹ اور سنگ وخشت کی عمارتوں کے انجینئر سے بلند مرتبہ کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن اسے معاشرہ کا قابل احترام ڈاکٹر یا انجینئر اسی صورت میں سمجھا جائے گا جب وہ اپنی منصبی ذمہ داریوں کو ادا کرے اور صرف کلاس روم کو اپنی حرکت وعمل کا سدرۃ المنتہی نہ سمجھے، انسان کامل اور مرد عاقل کی خصوصیات کا اسے حامل ہونا چاہیے، اخلاق کی خوشبو میں اسے گل تازہ کے مانند، فکر کی تابانی میں اسے خورشید سحر اور انسانیت کی کشت زار کے لئے اسے نوید بہار ہونا چاہیے، بازار اور تفریح گاہ سے اسے دور اور نفور ہونا چاہیے، اس کے قدم کے نقوش کتاب خانوں میں اور ایوان درس وحکمت میں پڑنے چاہئیں اور اس کے قلم کے نقوش اخبارات اور رسائل اور کتابوں کے صفحات میں نظر آنے چاہئیں۔ اس کی شخصیت کو بحیثیت مجموعی صالح انقلاب کا ہراول دستہ ہونا چاہیے، جہاں اس کا قدم ہو وہ جگہ رشکِ ارم ہو، جس مکان میں اس کا قدم ہو وہ جگہ میمنت لزوم ہو، جہاں اس کی سواری پہونچے ہر طرف سے باد بہاری پہونچے، وہ جس راستہ سے گذرے جائے وہ راستہ

مشک بار ہوجائے آج کے ماحول میں ایسے اساتذہ چاہے نہ ہوں لیکن تاریخ میں ایسی خصوصیات کے حامل معلمین گذرے ہیں جنہوں نے اپنی کیمیا اثری اور نفس گرم سے مردوں کو مسیحا اور ذرہ بے مقدار کو آفتاب و ماہتاب بنا دیا۔ یہ غلط فہمی ہے کہ استاد کا کام صرف تعلیمی مواد کا پڑھانا ہے، اس کا کام طلبہ کے اخلاق اور فکر و عمل کو بہتر بنانا بھی ہے، ایک با فیض اچھے استاذ کا کام صرف کتاب یا کورس کو ختم کرانا نہیں ہے بلکہ اس کو جہاں تک ہو سکے طالب علم کو مفکر، مدبر، مقرر اور محرر بنانا بھی ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے توسیعی خطبات، سمپوزیم، مکالموں مباحثوں، ڈراموں کا اور ہر اس بزم کے انعقاد کا انتظام کرنا چاہیے جس سے طالب علم کی عملی اور تقریری وتحریری صلاحیت کی نشو ونما ہو سکے اگر طالب علمی کے زمانہ میں طالب علم نے ان صلاحیتوں کو اجاگر نہیں کیا جس کی زندگی کے میدان میں داخل ہونے کے بعد ضرورت پیش آئیگی تو اس کا زجاج حریف سنگ نہ ہو سکے گا وقت کی رائج زبانوں میں مہارت پیدا کر کے اس کو خارہ شگافی کے طریقے سکھانا بھی ایک اچھے استاذ کی ذمہ داری ہے۔

ایک اعلی تعلیم گاہ میں اچھے استاذ کا لہجہ طلبہ کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ اور ہمدردانہ ہوتا ہے، اور غیر ذمہ دار استاد کا لہجہ حاکمانہ جابرانہ، افسرانہ اور تحکمانہ ہوتا ہے، وہ طالب علموں کے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے جو جیل کے افسر قیدیوں کے ساتھ کرتے ہیں، جن طلبہ کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کیا جاتا ہے وہ اخلاقی طور پر خراب ہوجاتے ہیں۔ ان کی نفسیات یہ ہوجاتی ہے کہ وہ ہمیشہ خود کو اپنے سے برتر شخص کا غلام محسوس کرتے ہیں۔ اور اپنے ماتحتوں کو اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں، جس توہین آمیز رویہ کا وہ خود شکار ہوں گے ایسا ہی رویہ دوسروں کے ساتھ اختیار کریں گے، کبھی کبھی ایک ناتربیت یافتہ استاذ طلبہ کو اس طرح کی دھمکی بھی دیتا ہے کہ ''تم لوگوں کو نمبر اور گریڈ دینا ہمارے ہاتھ میں ہے ہم تم لوگوں کو دیکھ لیں گے'' وہ طالب علم سے انتقام لینے پر اتر آتا ہے امتحان میں وہ گریڈ یا نمبر دینے میں بے ایمانی کرتا ہے، وہ طالب علم کو جس سے وہ ناراض ہوتا ہے ناکام کرنے اور تعلیم کے اگلے مرحلہ میں اس کو داخلہ نہ دلانے کے سوجتن کرتا ہے اور اپنے جونیر ساتھیوں کو بھی اپنی مجرمانہ حرکت میں شریک کر لیتا ہے۔ ایسے استاذ کا پیشہ مردم گری کے بجائے مردم دری ہے، کردار سازی کے بجائے کردار سوزی ہے۔ ایسے استاذ کی دہشت گردی کی وجہ سے طالب علموں کے اندر دوہری شخصیت پیدا ہوجاتی ہے یعنی ظاہر کچھ اور باطن کچھ، ظاہر میں فرماں برداری اور باطن میں نفرت۔ کبھی کبھی طلبہ میں بغاوت کی شکل میں ردعمل ظاہر ہوتا ہے طلبہ اسکول کے پرنسپل سے یا ادارہ کے ذمہ دار سے استاذ کی شکایت کرتے ہیں اور میمورنڈم پیش کرتے ہیں اور جلوس بھی نکالتے ہیں۔

طلبہ کا یہ طرزِ عمل ادب اور تہذیب کے خلاف ہے اس کی ہمت افزائی نہیں ہونی چاہئے، لیکن یہ استاذ کی شامت اعمال ہوتی ہے جو یہ صورت اختیار کر لیتی ہے تعلیمی اداروں میں بعض غلط قسم کے اساتذہ داخل ہو گئے ہیں جو طالب علم کو امتحان میں نمبر یا گریڈ دینے میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ طالب علم کس مذہب اور مسلک کا کس علاقہ کا ہے اور کس مادرِ علمی سے وابستہ رہ چکا ہے، وہ اس کا نیاز مند ہے یا کسی اور استاذ کا حلقہ بگوش ہے، یہ برائیاں غیر مرئی اور غیر ملموس ہیں، اگر ان کا مادی اور جسمانی وجود ہو جائے تو ان برائیوں کی بدبو سے تعلیم گاہ میں کسی کا ٹھہرنا مشکل ہو جائے۔ افسوس یہ ہے کہ بہت سے اداروں میں ایسے اساتذہ موجود ہیں۔ ایک غیر ذمہ دار اور ناتربیت یافتہ استاد کبھی اتنا کرپٹ بھی ہوتا ہے کہ اگر شعبہ میں یا ادارہ میں کوئی جگہ خالی ہوتی ہے تو وہ چاہتا ہے کہ یہ جگہ اس کے رشتہ دار عزیز وقریب کو مل جائے، حالانکہ ایک ہزار کینڈیڈیٹ ہوں گے جو اپنی صلاحیت کے اعتبار سے کہیں زیادہ فائق ہوں گے لیکن یہ استاد چاہے گا کہ دوسروں کا چراغ گل کر کے اپنے گھر میں اجالا کرے، دوسرے حق دار کا حق چھین کر کے اپنے گھر کی آمدنی میں اضافہ کرے، چاہے اس سے ادارہ کا وقار مجروح ہو، چاہے اس کی وجہ سے تعلیم کا معیار گر جائے، ایسا استاذ زبانِ حال سے طلبہ کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ آج جو ناانصافی میں کر رہا ہوں کل تم بھی اپنے وقت میں کرنا، عدل شائستگی اور شرافت سب بے معنی الفاظ ہیں جو سننے میں اچھے لگتے ہیں، فردوس گوش ہیں لیکن برتنے کے لائق نہیں ہیں۔

تعلیم وتربیت کے میدان کی یہ روایت رہی ہے کہ اس میں ہمیشہ چراغ سے چراغ جلائے جاتے ہیں لیکن اگر معلّمی کے منصب جلیل پر اس طرح کے لوگ فائز ہو جائیں، اگر استاد کا اپنا چراغ خود ہی بے نور ہو، اگر چراغ کا فتیلہ لو دینے کے بجائے دھواں دینے لگے، اگر چراغ کا تیل ماحول کو بدبودار بنانے لگے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسے استاد کی تربیت سے کس طرح کے شاگرد تیار ہوں گے۔

گر ہمیں مکتب است واین ملا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

تعلیم جب اونچے مرحلہ میں داخل ہوتی ہے تو اچھے استاذ کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں، جامعات کے اساتذہ کی علمی اور تعلیمی ذمہ داریوں کے بارے میں حرفے چند۔ مجھے اکثر ایسا محسوس ہوا ہے کہ جامعات یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے تمام اساتذہ بھی یونیورسٹی اور اس کی غرض وغایت سے واقف نہیں ہوتے ہیں وہ استاد اور طالب علم کے صحیح فرق سے بھی آگاہ نہیں ہوتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ طالب علم وہ ہوتا ہے جو کلاس روم میں کرسی پر بیٹھا ہوتا ہے اور ہوسٹل میں یا گھر پر رہتا ہے اور خستہ حال ہوتا ہے اور استاد وہ ہوتا

ہے جو کلاس میں کھڑے ہو کر پڑھاتا ہے، طالب علم کو جھڑکیاں دیتا ہے اور موٹی تنخواہیں پاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ استاد اور طالب علم میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ استاد بھی طالب علم ہی ہوتا ہے لیکن زیادہ ذمہ دار طالب علم۔ اس میں وہ کھلنڈرا پن نہیں ہوتا ہے جو عام طالب علموں میں پایا جاتا ہے۔ اس کا کام صحیح رہنمائی کرنا ہوتا ہے کلاس کے اندر بھی اور کلاس کے باہر بھی۔ منبر سے بھی اور خطابت کے اسٹیج سے بھی، کانفرنسوں اور میڈیا کے پلیٹ فارم سے بھی اور تصنیف و تالیف اور علمی اور ادبی اور تحقیقی مضامین کے ذریعہ بھی، یہ بات ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ یونیورسٹی کے کسی استاد کا منصبی فریضہ صرف کسی مطبوعہ قدیم یا جدید کتاب کی کلاس روم میں تدریس و تفہیم نہیں ہے۔ یہ کام تو پاٹھ شالوں اور چھوٹے اسکولوں اور مدرسوں میں ہوتا ہے، اگر یونیورسٹی کے ایک استاد کا منصبی فریضہ اسی قدر ہوتا تو نیشنل اور انٹر نیشنل سیمیناروں اور کانفرنسوں میں مقالات کے ساتھ شرکت کی اور تصنیف اور تالیف کے کاموں کی رپورٹ ہر استاذ کو ہر سال نہیں پیش کرنی ہوتی۔ یونیورسٹی کے استاذ کا کام علم کی دنیا میں (صرف اپنے ڈسپلن میں ضروری نہیں) اضافہ کرنا ہے۔ اسے ڈسپلن یا سبجیکٹ کی چار دیواری میں محدود نہیں ہونا چاہیے۔ اسے اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کو علم کی وسیع دنیا سے مربوط رکھنا چاہیے۔ علم و ادب کی دنیا میں ایسی دیواریں نہیں اٹھائی جاتی ہیں جہاں پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت ہو۔ ادب سماجی علوم اور سائنس کسی نہ کسی طور پر باہم دیگر ہم رشتہ بھی ہیں۔ پھر مختلف زبانوں کے ادب کا جاننا اور مختلف سماجی علوم کا جاننا اور ان موضوعات پر کتابیں پڑھنا اور لکھنا وسیع الثقافۃ اور وسیع المطالعہ ہونے کی دلیل ہے۔ عربی زبان کے بڑے ادیب وہ ہیں جن کی کتابیں شعر و ادب کے ساتھ ساتھ فلسفہ اور تاریخ پر اور مذہب اور تمدن پر بھی ہیں۔ ہندوستان کے ایک مشہور اور ممتاز ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے معاشیات میں ایم اے کیا تھا اور برلن یونیورسٹی سے اسی مضمون میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی۔ اس کے بعد ان کا علمی اور ادبی کام یہ تھا کہ انہوں نے افلاطون کی مشہور کتاب ''ری پبلک'' کا بہترین اردو میں ترجمہ کیا پھر بچوں کے لئے دلچسپ لیکن مفید کہانیاں بھی لکھیں جن کے مجموعہ کا نام ''ابوخان کی بکری'' ہے۔ مشہور عالم، معلم اور مفکر تعلیم مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ اعلیٰ تعلیم اور متوسط اور ابتدائی تعلیم کے درمیان غرض و غایت کا فرق ہے۔ یونیورسٹی کا ایک استاد صرف کلاس کا ٹیچر نہیں ہوتا۔ اس کا کام فکر و نظر اور علم و ادب کی دنیا میں کچھ اضافہ کرنا ہے۔ اہل علم کے سامنے کسی موضوع پر کوئی نیا نقطہ نظر پیش کرنا ہے۔ کوئی نئی تحقیق کوئی نیا انکشاف، کوئی نئی ذہنی تشکیل، فن کی کوئی نمود، کسی قسم کی جدت افکاری، کوئی نئی بصیرت

افروز رہنمائی، سوچنے کا کوئی نیا پہلو، کوئی نئی نظری یا علمی تنقید، کوئی اچھوتا خیال، علم و ادب کے راستہ سے انسانیت کی کوئی کارآمد اور مفید خدمت، قوم وملت کی فکری رہنمائی، فرقہ پرستی اور تعصب کی دیواروں کو ڈھانا، بدی اور انتشار کی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی تدبیر، قومی تعمیر کا منصوبہ، ورطۂ حالات سے قوم کو نکالنے کے لئے کوئی لائحہ عمل، نئی نسل کی ذہنی اور فکری اور اخلاقی تربیت، خوب وناخوب کی تمیز عطا کرنا یہ سارے کام یونیورسٹی کے استاد کے دائرہ کار کے اندر آتے ہیں۔ کیونکہ منصب کے لحاظ سے وہ ایک عالم اور مفکر اور معلم اخلاق ہوتا ہے اور اسے عالم اور مفکر ہونا چاہیے اور اسے اپنے علم وفکر کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی چاہیے، ورنہ اس کا شمار حقوق و فرائض میں توازن نہ برتنے کی وجہ سے ''مطففین'' میں ہوگا جس کے لئے قرآن میں ''ویل'' کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہلاکت اور بربادی کے ہیں۔ یہ تصور جو عام طور پر پایا جاتا ہے غلط ہے کہ استاد کا کام صرف کچھ اوراق پریشاں کی تعلیم دینا ہے، یا صرف کورس ختم کرنا ہے یا طلبہ کے سامنے کسی متن کی تشریح کر دینا ہے۔ یہ تصور یونیورسٹی کے لئے ازالہ حیثیت عرفی کے مرادف ہے۔ یونیورسٹی اعلیٰ تعلیم کا مرکز ہوتی ہے اور اعلیٰ تعلیم کے مقاصد میں تحقیق اور نظریہ پر ہی نظام ہائے زندگی کی بنیادیں استوار کی جاتی ہیں۔ سماج کی تعمیر و تخریب کا انحصار نظریات کے صالح اور فاسد ہونے پر ہوتا ہے۔ نظریات کی وسیع فضا میں جس میں مسلسل نظریات کے سٹیلائٹ داغے جاتے ہیں اور خیر وشر کے سنگھرش میں جو ہر آن جاری ہے اعلیٰ تعلیم سے وابستہ شخص کو قلم سے بھی اور قدم سے بھی ذہنی عمل کے ذریعہ اپنا رول ادا کرنا چاہیے، اعلیٰ اقدار کے فروغ کے لئے نہ کہ ذاتی مفادات کے لئے۔ مختلف پلیٹ فارم سے سماجی اصلاح کی تقریریں، اخبارات اور رسائل میں علمی ادبی اور فکری تحریریں، اس کی ذہنی بیداری اور احساس ذمہ داری کی آئینہ دار ہوں گی۔ مقصد کے اعتبار سے یونیورسٹی ایسی کارگاہ کا نام ہے جہاں صرف علمی قابلیت نہیں پیدا کی جاتی ہے بلکہ ذوق بھی پیدا کیا جاتا ہے، کردار بنایا جاتا ہے، نیکیاں پیدا کی جاتی ہیں اور برتی جاتی ہیں، علم میں توانائی اور طاقت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کا تعلق سماجی زندگی سے ہو۔ مثال کے طور پر ملک میں اگر قومی یک جہتی کی ضرورت ہے تو کسی یونیورسٹی کے استاد کو چاہے وہ کوئی بھی سبجکٹ پڑھاتا ہے یہ کہنے کا حق نہیں کہ اس کام کا تعلق ملک کے سیاست دانوں سے ہے، اور مدبروں سے ہے ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ سماج میں رشوت غیبت جھوٹ کرپشن پھیل گیا ہو تو ایک استاد کو اپنے دائرہ علم میں اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ وہ اپنے منصب کے اعتبار سے معلم اخلاق بھی ہے۔ نظریہ کی اصلاح ہو یا کردار کی اصلاح دونوں کی ذمہ داری یونیورسٹی پر عائد ہوتی ہے۔ ایک

استاد کو اپنے مطالعہ اور تجربہ کی روشنی میں جس بات کو وہ صحیح سمجھتا ہے برملا کہنا چاہیے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کو تحریر و تقریر کی، حکومت کی پالیسیوں سے تعمیری اختلاف کرنے کی، انجمنوں اور جماعتوں سے وابستہ ہونے کی اور بین الاقوامی اور قومی کانفرنسوں میں شرکت کی جو اتنی ساری آزادیاں دی گئیں وہ اعلیٰ تعلیم کے اسی تصور کے مطابق ہیں۔ یہ مہذب شائستہ اور بارآور سماج کی تخلیق کے لئے ہیں۔ بہت سے لوگ یونیورسٹی میں نہیں ہوتے لیکن وہ سارے کام کرتے ہیں جو یونیورسٹی کے استاد کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور بہت سے لوگ یونیورسٹی سے وابستہ ہونے کے باوجود نہ یونیورسٹی سے واقف ہوتے ہیں اور نہ بحیثیت استاد اپنی وسیع تر ذمہ داریوں سے۔ معیار اتنا گر گیا ہے کہ اساتذہ کی نظر محدود، ان کی گفتگو غیر علمی، ان کی زبان غیر شائستہ، ان کے طور طریق دجل وفریب ودسیسہ کاری کنبہ پروری اور خویش نوازی سے رسوا، غیبت سرائی ان کا شیوہ، دوسروں سے لکھوا کر اپنے نام سے مضامین اور کتابیں شائع کرنا ان کا وطیرہ، ان کا بس چلے تو اپنی بیوی یا بچہ کو اپنے ادارے میں ملازمت دلانے کے لئے زمین اور آسمان کے قلابے ملادیں، متوقع اکسپرٹ کی خوشامد کرنے کے لئے ان کے گھروں پر جائیں۔ اور انصاف اور شرافت کا خون کردیں۔ ایسے استاد ملک وقوم کا بیڑا غرق کرسکتے ہیں۔ اس قسم کے استاد یونیورسٹی کے مقدس حرم میں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ایک فارسی شاعر کو یہی غم تھا کہ ''طوق زریں ہمہ در گردن خرمی بینم'' یونیورسٹی اپنے مقاصد پورے نہ کرے اور اس سے متعلق لوگ کرپٹ ہوجائیں، صالح اقدار کو فروغ دینے کے بجائے کنبہ پروری میں لگ جائیں پڑھنے لکھنے کے بجائے سیاست کریں اور طلبہ کے سامنے برے اخلاق کا نمونہ پیش کریں تو یہ پورے معاشرے کے لئے خطرہ کی بات ہے۔ اس لئے بار بار ضرورت ہیکہ تعلیم گاہ اور یونیورسٹی کے بلند کردار کو اور اس کے بلند مقاصد کو طلبہ اور اساتذہ دونوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہ اس لئے کہ پوری قوم کا مستقبل تعلیم کے صحت مند اخلاقی نظام پر منحصر ہے۔ اور اس اخلاقی نظام کو سنبھالنا سب کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اساتذہ کو خود اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ وہ طالب علموں کے لئے بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں یا نہیں صرف مقررہ نصاب کا پورا کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اخلاقیات کا نمونہ پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ طلبہ کی جسمانی ذہنی اور اخلاقی ترقی میں مددگار بننا بھی ضروری ہے۔ تعمیر وتخلیق کا رجحان پیدا کرنا بھی ضروری ہے اس کے بغیر طالب علم سماج کا بہترین فرد نہیں بن سکتا ہے اور نہ تعلیم گاہ نمونہ کی تعلیم گاہ بن سکتی ہے۔ استاد کی حیثیت جہاز کے کپتان کی ہوتی ہے یا چمن کے پھولوں کے مالی کی ہوتی ہے۔ اگر کپتان جہاز کو غلط رخ پر لے جائے یا مالی پھولوں کو مسلنے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنا فرض نہیں ادا کیا۔ تعلیم

گاہ کی روح اور جان استاد ہوتا ہے۔ طالب علموں کی بہبود اور صلاح وفلاح کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے اسی لئے اسے قابلیت، صلاحیت، نیکی، شرافت اور خوش خلقی کا مجسمہ ہونا چاہیے۔ اسے مشعل راہ ہونا چاہیے۔ وہ اپنی شخصیت کے اعتبار سے انسانیت سازی کا ایک کارخانہ ہے اگر کارخانہ اچھا ہے تو اس کے کارخانہ سے اچھے انسان ڈھلیں گے اور ان سے اچھا معاشرہ تیار ہوگا۔ ایک تعلیم گاہ پاکیزہ زندگی کا معدن بھی ہے مخزن بھی ہے اور پاکیزہ زندگی کی ضامن بھی ہے لیکن یہ چیز استاد کی پاکیزگی اس کی عفت اور پاکدامنی پر منحصر ہے، اگر وہ علم کے موتی نہیں لٹاتا ہے اگر وہ ادب آموز نہیں ہے اگر وہ یوسفی کے بجائے زلیخائی کرنے لگتا ہے اگر وہ فرض شناس محتاط اور بااصول نہیں ہے تو وہ تعلیم گاہ ناکام ہے اور ایسی تعلیم گاہ سے قابل اور باکردار اور خوش گفتار طالب علم نہیں نکل سکتے ہیں اور ایسی معلّمی باعزت اور باوقار نہیں ہے جس کے دامن پر فرض کے ادا کرنے کے بارے میں کوتاہی یا بے کرداری کے دھبے ہیں۔

تعلیم تجارت نہیں ہے یہ موقر اور معزز پیشہ ہے۔ جو شخص معلّمی کے پیشہ کو اپنائے اسے اوصاف حمیدہ کا مالک ہونا چاہیے۔ اس کے چال چلن پر لوگوں کو شبہ نہیں ہونا چاہیے، اسے لوگوں کی تنقیص اور عیب جوئی سے بری ہونا چاہیے۔ اسے اپنے پیشہ کو سنجیدگی اور ایمان داری کے ساتھ برتنا چاہیے۔ اسے مطالعہ کا عادی ہونا چاہیے۔ استاد کا مرتبہ والدین سے کم نہیں۔ استاد کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ گردوپیش کے مسائل کو سمجھے اور مسائل کے حل کو جانے اور طالب علموں کو اس کے لئے تیار کرے معاشرہ کی برائیوں سے آگاہ کرے اور ان کو مٹانے کی ہمت اور حوصلہ پیدا کرے۔ بدی سے نفرت دلائے، نیکی کا شوق پیدا کرے، اسے دل و دماغ میں بٹھائے، کمزوروں اور ضعیفوں کی خدمت کا جذبہ پیدا کرے اور خود نیک کاموں کا اور اچھی سیرت کا نمونہ پیش کرے۔ اخلاقی قدروں کی تبلیغ کا سب سے موثر ذریعہ عمل ہے۔ روحانیت اور مذہب کی تعلیم کردار کے ذریعہ پھیلتی ہے۔ اگر استاد کی زندگی عطر فروش کا معطر اشتہار بن جائے تو کم تلقین وتبلیغ کے بغیر بھی صرف فیضان نظر سے نیکی کی صفات طالب علموں کے اندر سرایت کر جائیں گی، استاد کی سیرت اور بصیرت دونوں کا انعکاس طلبہ کی زندگی میں ہوگا۔ وہ اس کے نقش قدم پر چلیں گے اور اسے اپنی زندگی کے لئے رہنما بنائیں گے اور اچھے انسان بنیں گے۔ اس حقیقت کو اقبال نے شعر میں اس طرح کہا ہے:

وہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آداب فرزندی

(خطبات تعلیم وتربیت)

☆☆☆

تعلیمات اسلام

غیر مسلموں سے تعلقات اوران کے حقوق

ابوسعد اعظمی
ادارہ علوم القرآن علی گڑھ

اسلام کی تصویر جن مختلف پہلوؤں سے بگاڑنے بلکہ مسخ کرنے کی مسلسل کوشش ہوتی رہتی ہے اس میں ایک اہم پہلو غیر مسلموں سے اہل اسلام کے تعلقات کی نوعیت کا ہے، کہا جاتا ہے کہ اسلام انفرادیت پسند ہے .وہ مسلمانوں میں علیحدگی کے جذبات ابھارتا ہے .وہ انہیں دوسروں سے کاٹتا اور الگ تھلگ کرتا ہے .اپنوں اور غیروں کے درمیان اتنا زبرست فرق پیدا کرتا ہے کہ غیروں کے ساتھ عام انسانی تعلقات کا بھی روادار نہیں ہوتا .وہ اخلاق کا درس ضرور دیتا ہے لیکن اس کا تعلق اپنے ماننے والوں سے ہوتا ہے دوسروں سے نہیں .یہ ایک بے بنیاد اعتراض ہے .اسلام کی اس خود ساختہ تصویر کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے .یہ جن ذہنوں کی پیداوار ہے وہ یا تو ناواقفیت کا شکار ہیں یا دوسروں کو فریب اور دھوکہ دینا چاہتے ہیں.

اسلام ایک عالمی دین ہے ،وہ خدا کا آخری پیغام ہے جو انسانوں کو دنیا و آخرت کی کامیابی کی راہ دکھاتا ہے اس کا خطاب سب انسانوں سے اور ان کے سبھی طبقات سے ہے .'' کہہ دو کہ اے لوگوں میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں'' (اعراف/۵۸).جس دین کا پیغام انسانیت اور اس کے سبھی طبقات کے نام ہو، جو اس حیثیت سے سامنے آئے کہ وہ سارے عالم کی فلاح ونجات کا ذریعہ ہے وہ کسی طبقہ سے نفرت وعداوت کا سبق نہیں دے سکتا ورنہ اس کا خطاب محدود ہو کر رہ جائے گا .اسلام نے تو اس بات کی ہدایت کی ہے کہ گفتار و کردار میں، دعوت میں ،اپنے طرز عمل میں ایسا رویہ اختیار کیا جائے جس سے بدترین دشمن کی بھی دشمنی ختم ہو جائے اور وہ دوستوں کی صف میں آجائے۔ (ملاحظہ ہو حم السجدۃ/۳۴۔۳۵).

یہ واقعہ ہے کہ اسلام مسلمانوں کو باہم اعلی اخلاقی رویہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے .انہیں ایک دوسرے کا بھائی قرار دیتا ہے اور ان کے باہم اخلاقی اور قانونی حقوق مقرر کرتا ہے .ان کے درمیان تعاون وتناصر کا جذبہ بیدار کرتا ہے .لیکن اس سے یہ مفروضہ قائم کر لینا کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ تعصب ،نفرت ،حقارت اور عدم رواداری کی تعلیم دیتا ہے اور اس پر یہ الزام عائد کرنا کہ اسلام ایک جابرانہ اور

کلیت پسندانہ نظام کا داعی ہے .اس میں رواداری اور وسعت نظر نہیں ہے .وہ حریت فکر ،آزادی خیال ،اور اختلاف رائے کی آزادی نہیں دیتا .وہ جارحیت اور تشدد کا علمبردار ہے کس قدر بے بنیاد اور مضحکہ خیز الزام ہے.

اسلام نے اس امت کو ایک اعلی نصب العین دیا ہے کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کی علمبردار بن کر اٹھے .انسانوں کو ان کی دنیا و آخرت کی فلاح کا پیغام دے .اس دین کے بارے میں یہ تصور کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ وہ انسانوں کے دلوں میں کدورت اور نفرت پیدا کرتا ہے۔ انہیں ایک دوسرے کا حریف اور دشمن بناتا ہے اور ان کے تعلقات میں بگاڑ اور فساد کا ذریعہ بنتا ہے .اسلام نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اجنبیت کی دیوار نہیں کھڑی کی ہے بلکہ ان کے تعلقات کو وہ ایک سماجی ،معاشرتی اور معاشی ضرورت سمجھتا ہے .اگر غیر مسلم سے خونی رشتہ اور خاندانی تعلق ہو تو اسے وہ خاص اہمیت دیتا ہے .اسلامی تعلیمات صاف بتاتی ہیں کہ اسلام پر سختی سے قائم رہتے ہوئے اور اس کے احکام کی پوری طرح پابندی کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کے افراد سے انتہائی شریفانہ روابط رکھے جاسکتے ہیں اور رکھے جانے چاہئیں .یہ دینداری کے منافی نہیں بلکہ اس کی ہدایت کے عین مطابق ہے.

جن غیر مسلموں سے خون اور رشتہ کا تعلق نہیں ہے ان کے سلسلے میں عمومی ہدایات ہیں جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں .بعض اخلاقی ہدایات مسلمانوں کو خطاب کر کے دی گئی ہیں لیکن ان ہدایات پر عمل جس طرح مسلمانوں کے سلسلے میں ہوگا اسی طرح غیر مسلموں کے سلسلے میں بھی ہوگا ،دونوں کے ساتھ الگ الگ رویہ نہیں اختیار کیا جائے گا .قرآن مجید میں والدین اور قرابت داروں کے علاوہ یتیموں،مسکینوں ،قیدیوں ،پڑوسیوں، مسافروں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے .اور ان کے ساتھ غیر اخلاقی سلوک کی مذمت کی گئی ہے .یہ عام حکم ہے اس لئے حسن سلوک ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مطلوب ہے .اس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے،

انسان کا عملا سب سے قریبی تعلق اس کے پڑوس سے ہوتا ہے .یہ تعلق جتنا مضبوط ہوگا وہ اتنا ہی سکون واطمینان محسوس کرتا ہے .اگر کسی کو یہ یقین ہو کہ پڑوسی اس کے لئے خطرہ نہیں ہے،اس سے اسے کوئی نقصان اور گزند نہیں پہنچے گا ، بلکہ اس کی جان ومال ،عزت وآبرو محفوظ رہے گی اور وہ اس کے دکھ درد اور آسائش وراحت میں شریک ہوگا تو وہ یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ کاروبار حیات میں اپنی ذمہ داری ادا کرسکتا ہے ورنہ وہ سخت دشواریوں سے گزرے گا .اسلام نے انسان کو بہترین پڑوسی بننے کی تعلیم دی ہے اور حسن سلوک کی یہ تعلیم مسلم اور غیر مسلم کی تفریق سے ماوراء ہے.

قرآن وحدیث کی بہت سی تعلیمات وہ ہیں جو

مسلم معاشرہ کے پیش نظر دی گئی ہیں .ان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہئے .لیکن معنوی لحاظ سے یہ ہدایات عام ہیں ان سے غیر مسلم خارج نہیں ہیں .امام بخاریؒ کی الادب المفرد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''دعوت دینے والے کی دعوت قبول کرو، ہدیہ واپس نہ کرواور مسلمانوں کو نہ مارو''.اس کی تشریح و ترجمانی کے لئے آپ ﷺ کا عمل ہمارے لئے اسوہ ہے .آپ ﷺ نے ایک یہودیہ عورت کی دعوت قبول کی ہے جس سے فقہاء نے یہ استنباط کیا ہے کہ اگر غیر مسلم کی دعوت میں حرام شے کا احتمال نہ ہوتو اس کی دعوت قبول کی جاسکتی ہے .اسی طرح غیر مسلم سے تحائف کے تبادلہ میں آپ ﷺ کے پیش نظر اسلام اور مسلمانوں کا مفاد رہا ہے .آپ ﷺ نے جن لوگوں کے بارے میں دیکھا کہ ان کے تحائف قبول کرنے سے ان کی تالیف قلب ہوگی اور وہ اسلام کی طرف مائل ہوں گے ان کے تحائف قبول فرمائے اور انہیں جوابا تحائف بھی دیے اور جہاں اس طرح کی مصلحت نہیں تھی وہاں آپ ﷺ نے تحائف بھی رد کر دیے .اسی طرح مسلمانوں کو مت مارو کا ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے کہ ان کے علاوہ جو ہیں وہ ہمارے حسن سلوک کے محتاج نہیں ہیں.

ہندستان جہاں مختلف مذاہب اور متعدد افکار و خیالات کے ماننے والے لوگ آباد ہیں .اس کے تناظر میں یہاں ہماری ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے .لہذا اگر ہمارے قرب وجوار میں کوئی غیر مسلم آباد ہے تو اس کے ساتھ ان تمام انسانی اخلاقیات کا لحاظ رکھنا چاہئے جو ایک مسلمان کے ساتھ اختیار کئے جاتے ہیں .مثلا اس کی ہدایت کے لئے دعا کرنا ، بیمار ہو جائے تو مزاج پرسی اور عیادت کے لئے جانا ،اس کا اکرام کرنا ،اس کی تعزیت کے لئے جانا ،اگر تنگ دست ہو تو اس کی مالی مدد کرنا،غریب ومفلوک الحال ہوتو اس کی خبر گیری کرنا ،اس سے کاروباری تعلقات قائم کرنا ،اس کے ساتھ عدل وانصاف سے پیش آنا بعض فقہاء نے غیر مسلم کو سلام کرنے کی بھی اجازت دی ہے البتہ جمہور فقہاء اس کے عدم جواز کے قائل ہیں .اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت طیبہ میں ان تمام اعمال کی نظیریں موجود ہیں.

اسلام نے غیر مسلموں سے ایمان وعقیدہ کے سارے اختلاف کے باوجود ان سے تعلقات رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی جو بے نظیر تعلیم دی ہے اس سے واقفیت کے بعد ایک سوال پیدا ہوتا ہے یا پیدا کیا جاتا ہے وہ یہ کہ قرآن کریم نے غیر مسلموں سے عدم موالات اور ان سے بے تعلقی کی بھی تو ہدایت کی ہے .اسے کس طرح نظر انداز کیا جاسکتا ہے .اس ہدایت کی سنگینی اس وقت بڑھ جاتی ہے جب کہ وہ مخالفین سے جنگ اور جہاد کا حکم دیتا ہے .یہ سوال بار بار اور مختلف انداز میں اس طرح اٹھایا جاتا ہے گویا قرآن مجید کی اصل تعلیم ہی یہ ہے کہ غیر مسلمین سے مبارزت اور کشت وخون کا بازار گرم رکھا جائے اور قرآن اسی لئے نازل ہوا ہے کہ جو اسے نہ مانے اس کا سر تن سے

جدا کر دیا جائے .قرآن مجید کی جن آیات میں غیر مسلمین سے تعلقات نہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے ان کا موقع ومحل اور سیاق وسباق بالکل الگ ہے .اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے غلط فہمی کا امکان رہتا ہے .درحقیقت مدینہ میں چھوٹی سی اسلامی ریاست کی تشکیل نے مخالفین کی صفوں میں اضطراب اور ہلچل پیدا کر دی اور مخالفت کی آندھی زیادہ شدت سے ہر طرف سے چلنے لگی .مشرکین اور یہود و نصاریٰ اپنے اپنے اختلافات کو بھول کر اسلام کے خلاف متحد ہو گئے .ہر طرح کی سازشوں کا ایک جال بچھا دیا گیا اور مسلسل حالت جنگ قائم کر دی گئی .ان حالات میں مسلمانوں کو اسلام پر ثابت قدمی کی ہدایت کی گئی .دین وایمان کے تقاضے واضح کئے گئے اور بتایا گیا کہ جو لوگ اسلام کے دشمن ہیں اور اسے بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں ان سے انہیں دور رہنا چاہئے ،ان سے رازدارانہ تعلقات اور ذہنی قربت و یگانگت ایمان کے منافی ہے .دنیا کی کوئی بھی حکومت دشمن سے تعلقات قائم کرنے ،اس سے رازدارانہ معاملات کرنے ،اسے خفیہ معلومات فراہم کرنے اور بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کی سازشوں میں شریک ہونے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی .مسلمانوں کو اپنے ان مخالفین سے تعلق نہ رکھنے کا حکم قرآن مجید کی جن آیات میں دیا گیا ہے ان کے آگے پیچھے اور بعض اوقات ان ہی آیات میں اس کا پس منظر صاف موجود ہے.

جہاں یہ صورتحال نہ ہو قرآن مجید نے مشرکین اور غیر مسلمین سے بہتر روابط رکھنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے منع نہیں کیا ہے . چنانچہ سورۃ ممتحنہ کے شروع میں اہل ایمان سے یہ کہا گیا ہے کہ: ''جو لوگ اللہ تعالی کے اور خود تمہارے دشمن ہیں، جنہوں نے تمہارے ساتھ ہر طرح کی زیادتی کی انہیں اپنا ولی نہ بناؤ'' اسی کے فورا بعد ہے: ''اللہ تعالی منع نہیں کرتا ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور عدل وانصاف کا رویہ اختیار کرنے سے جنہوں نے تم سے دین کی وجہ سے جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے بے دخل نہیں کیا '' (الممتحنہ/۸۔۹) یہ صاف اور واضح ہدایت ہے اس بات کی کہ ان ہی لوگوں سے عدم تعلق سے منع کیا گیا ہے جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کی، انہیں ختم کرنے اور مٹانے کی کوشش میں لگے رہے اور اسلامی ریاست کے خلاف سازشیں کرتے رہے، جن غیر مسلموں کا رویہ اس کے خلاف ہو اور جن سے مسلمانوں کی کوئی جنگ نہ ہو ان کے ساتھ عدل و مساوات اور مصالحت و ہمدردی کا رویہ اختیار کرنا اسلام کی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے .قرآن مجید نے مخالفین اور دشمنوں کے ساتھ جس رویہ کی ہدایت کی ہے اسے غیر مسلموں کے بارے میں ایک عام رویہ قرار دینا کسی طرح درست نہیں ہے.

☆☆☆

تذکرہ

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ اور دینی تعلیمی کونسل اُتر پردیش

مولانا طارق شفیق ندوی
جنرل سکریٹری، آل انڈیا ملّی کونسل، مشرقی اُتر پردیش

امام المسلمین، عالم ربّانی، داعی الی اللہ حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ۵ر دسمبر ۱۹۱۳ء کو ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جسے حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی داستان دعوت عزیمت وراثت میں ملی ہے۔ اور اصلاح و ارشاد اور تبلیغ و جہاد جس کی شناخت ہے۔ ان کے والد ماجد مولانا حکیم سیّد عبدالحئ حسنیؒ ولادت ۱۸۵۷ء وفات ۱۹۲۳ء ایک بلند پایہ ادیب ومورخ اور ندوۃ العلماء جیسی تعلیمی واصلاحی تحریک کے ناظم ثانی تھے اور ان کی والدہ ماجدہ خیر النساء ولادت ۱۸۷۸ء وفات ۱۹۶۸ء حافظ قرآن، تہجد گزار، سحر خیز اور دعا و مناجات کا خاص ذوق رکھنے والی خاتون تھیں۔ خود مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ ناظم ندوۃ العلماء، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی کی شخصیت بھی ہندوستان کی عظیم، منفرد اور عالم اسلام کی محبوب ترین شخصیت تھی۔ اور راقم الحروف کے نزدیک ان کی عالمی مقبولیت ومحبوبیت کی بنیادی وجہ اخلاص، تعلق مع اللہ، مال و دولت سے بے نیازی اور جاہ طلبی سے دوری تھی اور خاک کی آغوش میں ''تسبیح و مناجات'' پر وسعت افلاک میں ''تکبیر مسلسل'' کو ترجیح دینے کے سبب تھی۔ چنانچہ دین ودنیا کی جامع اور اس عبقری شخصیت نے جب ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو سفر آخرت اختیار کیا تو سب نے یہ محسوس کیا کہ ایک روشن چراغ تھا جو گل ہو گیا۔ عجم وعرب میں یکساں طور پر صف ماتم بچھ گئی اور ہر آنکھ اشکبار ہوگئی اور راقم نے اسے اس صدی کا عظیم سانحہ قرار دیا۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو پکارے ہائے گل ، میں چلاؤں ہائے دل

۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا۔ خوشیوں کے چراغ جلے اور امیدوں کی شمعیں روشن ہوئیں۔ لیکن فوراً ہی ملک کا سیاسی منظر نامہ تبدیل ہو گیا۔ فرقہ پرستی اور لسانی عصبیت کو عروج حاصل ہوا۔ ناخوشگوار واقعات جنم لینے لگے۔ ملک کفن و کافور سے مہک اُٹھا۔ اجالوں کی جگہ اندھیروں نے لے لی۔ تاریکی دور تک پھیلتی چلی گئی۔ حکومت کی بے ضمیری نے مسلمانوں کو حاشیہ پر کھڑا کر دیا۔ حالات سے گھبرا کر مسلمان موت وزیست کی دہائی دینے لگے۔ آئے دن ان کے وجود وبقاء کے مسئلہ کے ساتھ نئی نسل کے دینی عقائد اور ملّی تشخص کا خدشہ بھی لاحق ہوتا چلا گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب حکومت نے نئے نصاب تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کے مذہبی اعتقادات اور اسلامی تہذیب ومعاشرت کو نقصان پہونچانے کا فیصلہ کر لیا۔

نئ نسل کے ارتداد کے اس عظیم خطرہ کو اور اس کے مضمرات کو واضح طور پر سب سے پہلے ضلع بستی کے مرد جلیل قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم نے محسوس کیا اور ۱۹۵۱ء میں اس کے تدارک و علاج اور مسلمان بچوں اور بچیوں کی خود کفیل مذہبی تعلیم کے لئے ''انجمن تعلیماتِ دین، ضلع بستی'' کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۵۳ء میں مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ کو اس تحریک و تنظیم کا علم ہوا اور اس کے تجربات سے آشنا ہوئے تو اس کی ضرورت و افادیت کو محسوس کرتے ہوئے صوبائی سطح پر اس کام کو پھیلانے کی تجویز رکھی اور ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ اور پھر اس کے بعد مورخہ ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء کو ضلع بستی میں ایک ''صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس'' منعقد ہوئی اور اس پہلی کانفرنس کی صدارت کے لئے قرعۂ فال ''مفکر اسلام'' کے نام نکلا۔ اسی کانفرنس میں ''دینی تعلیمی کونسل اُتر پردیش'' کی تشکیل ہوئی اور اس کی صدارت کے لئے بھی مفکر اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ ہی کا انتخاب ہوا۔ جس کے وہ اپنے دردمند اور پرسوز دل، اپنی بلند نگاہی، اپنی وسعت علمی اور نئے رجحانات اور جدید علوم سے واقفیت کی بنا پر بجا طور پر مستحق تھے۔

چالیس سال تک ''مفکر اسلام'' اس عظیم اور دینی تحریک کے صدر رہے اور پوری دلجمعی کے ساتھ اپنے خون جگر سے اس کو استحکام بخشا۔ اور پوری للّٰہیت کے ساتھ تادمِ آخر مسلسل ایک قائد کی حیثیت سے دینی تعلیمی کونسل کی زرّیں خدمات کی تاریخ رقم کرتے رہے۔ میرے اُستاذ اور دینی تعلیمی کونسل کے موجودہ جنرل سکریٹری ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی حفظہ اللہ نے اپنے ایک مضمون میں بڑی فراخ دلی اور عقیدت سے اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''چالیس برس کی اس طویل مدت میں تحریک و تنظیم کے لئے ہمہ وقت کی فکرمندی، ہندوستان میں نوجوان نسل کے ایمان و عقیدہ کی حفاظت اس کی اہمیت اور افادیت پر اظہارِ خیال اور حالاتِ حاضرہ پر مومنانہ شان سے جرأت مندانہ تنقید و تبصرہ کی ایک تاریخ ہے جو حضرت مولانا کے نام نامی سے مزین ہے۔'' (فکر اسلامی خاص نمبر)

چنانچہ جب ۱۳ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو مفکر اسلام نے نماز جمعہ سے قبل داعی اجل کو لبیک کہا تو قوم کے ہر فرد نے محسوس کیا کہ شانِ امتیازی کے ساتھ ملّت کی رہبری و رہنمائی کی وہ آخری شمع بھی گل ہوگئی جو بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کی حیثیت رکھتی تھی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علامہ اقبالؔ

راقم اس مختصر سے مضمون میں دینی تعلیمی کونسل اُتر پردیش کے پلیٹ فارم سے ''مفکر اسلام'' کے دو اہم کارناموں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

(۱) ۱۹۶۲ء میں یوپی کی حکومت نے ایک ایسا نصاب تعلیم جاری کیا جو مسلمانوں کے بنیادی اعتقادات و مسلمات سے متصادم تھا جس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ نئ نسل اپنے معاشرہ سے منقطع اور اپنے مذہب سے منحرف ہو جائے تو مفکر اسلام بے چین و مضطرب ہوگئے اور ریاست کے ماہرین تعلیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''ہمارے ماہرینِ تعلیم کو اس نقطہ کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ مسلمان ان سرکاری اسکول اور تعلیمی مرکزوں کو اپنے

بچوں کی تعلیم گاہ اور تربیت گاہ سمجھیں۔ان کے عقیدہ اور مذہبی ضمیر کی قتل گاہ نہ سمجھیں۔'' اور بہت واضح انداز میں مسلمانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے پختہ عزم وارادہ کا اظہار ان لفظوں میں کیا کہ ''یہ صورت حال ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے اور ہم کو اپنے بچوں کا ان تعلیم گاہوں کے فوائد اور سہولتوں سے محروم رکھنا گوارہ ہے لیکن ان کے ایمان، دینی احساسات اور شعور کو خطرہ میں ڈالنا اور مشرکانہ اعمال میں شریک ہونا کسی قیمت پر گوارہ نہیں۔'' (ندائے ملّت ۲۰ر جولائی ۱۹۶۲ء)

اس مومنانہ فراست، عالمانہ بصیرت اور شان قیادت کی جرأت مندانہ گرفت اور فیصلہ کا بروقت نتیجہ خیز اثر یہ ہوا کہ محکمۂ تعلیم نے اپنی تمام ہدایات کو واپس لے لیا۔

(۲) اسی طرح ۱۹۹۷ء میں جب حکومت اُتر پردیش نے نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ اسکولوں میں ''وندے ماترم'' کو نافذ کیا اور بھارت ماتا کی تصویر پر پھول چڑھانا لازمی قرار دیا تو اس موقع پر بھی مفکر اسلام نے اپنے اضطراب و بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ ملک کو ایسی خطرناک منزل کی طرف لے جانے کا اقدام ہے جس کے تصور ہی سے ایک محبّ وطن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔'' (خطبۂ صدارت علی گڑھ، اپریل ۱۹۹۸ء)

حکومت کے اس فیصلہ کا مفکر اسلام کے دل ودماغ پر اتنا گہرا اثر تھا کہ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ندوۃ العلماء میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے پوری جرأت واستقامت کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ '' اگر یہ صورت حال باقی رہتی ہے اور حکومت کی طرف سے وندے ماترم اور پھول چڑھانے کا غیر اسلامی فیصلہ تبدیل نہ کیا گیا تو ایسے تمام اسکولوں سے مسلمان اپنے بچوں کو نکال لیں گے۔ ہمارے لئے تعلیم سے زیادہ عقیدۂ توحید اور دین کی حفاظت کا مسئلہ اہم ہے۔'' (تکبیر مسلسل)

اس مومنانہ اعلان اور جرأت مندانہ تیور نے پورے ملک میں ہلچل پیدا کر دی۔حکومت جو ابھی تک متوجہ نہیں ہو رہی تھی، اچانک اس کے رویے میں تبدیلی آئی اور ''وندے ماترم'' کا حکم اور پوری اسکیم کو منسوخ کرنے کا آرڈر جاری کیا۔وزیر برائے پرائمری تعلیم اروند شکلا کو ان کے عہدہ سے برطرف اور اس وزارت کے سکریٹری آر. ایس. دویدی کا ٹرانسفر کر دیا۔

موجودہ دور میں حکومت کی، مسلمانوں کی اور عصری تعلیم گاہوں کی جو صورت حال ہے اور مشاہدے اور تجربے میں جو واقعات سامنے آئے ہیں اس کے پیش نظر راقم الحروف اپنے جن تفکرات وخیالات کو آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہے تاکہ دینی تعلیمی کونسل اُتر پردیش کی عصری معنویت کا اندازہ لگا کر ملّت میں کچھ کر گزرنے کا جذبہ پیدا ہو سکے۔اس کے لئے بھی مفکر اسلام کے خطبات کے چند اقتباسات کو پیش کر رہا ہے اور ان کی تحریروں سے ایک ایک حرف مستعار لے رہا ہے۔

''اس تحریک کو ہم اسلام کے احیاء اور ہندوستان کے خاص حالات میں اسلامی شعور کی بیداری کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔اس چیز سے تحریک کا براہِ راست تعلق نہ سہی لیکن بالواسطہ گہرا تعلق ہے۔ اس کے پروگراموں کے ذریعہ کانفرنس اور جلسوں کے سبب عوام میں ایک بیداری اور احساس شعور پیدا ہوتا ہے۔'' (خطبۂ افتتاحیہ، دینی تعلیمی کانفرنس، لکھنؤ، ۱۹۶۱ء)

''یہ تحریک وقتی ہنگامہ، دنیاوی عیش وعشرت کا سامان نہیں ہے

بلکہ آپ کی یہ تحریک مستقل طور پر زندگی کا جزء ہے اور جب تک آپ تحریک کو اپنی زندگی کا جزء نہیں بنائیں گے اس وقت تک آپ کی کامیابی یقینی نہیں ہے۔''

''ہمیں سوچنا چاہیے کہ یہ تحریک ہماری حیات کا اصل سرمایہ اور سب سے عزیز متاع ہے اگر ہم نے اس تحریک میں پورے طور پر حصہ نہ لیا اور پورے جوش و جذبہ کے ساتھ اس کام کو انجام نہ دیا تو ہمیں زندگی کی کسی منزل میں کسی بات کی ضمانت نہیں مل سکتی۔'' ''تحریک کی کامیابی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ آپ خود اپنی ذات کو متحرک کریں، اپنے اندر جذبہ اور جوش، اپنے ذہن و دماغ میں فکر اور اپنے قلب وجگر میں احساس اور تڑپ پیدا کریں۔'' ''جو قوم خود فیصلہ نہیں کرسکتی، دنیا کی ساری تدبیریں، حکمت و سائنس بلکہ طاقت ور سلطنتیں بھی اس قوم کی مدد نہیں کرسکتیں۔ جن قوموں نے اپنے ضمیر کے ساتھ اپنے عقیدے اور اپنے ایمان کے ساتھ ان اصولوں کے ساتھ جو ان کو جان سے زیادہ عزیز تھے باقی رکھنے کا فیصلہ نہیں کیا ان کا نام حرف غلط کی طرح لوحِ جہاں سے مٹا دیا گیا۔'' (خطبۂ صدارت، ریاستی دینی تعلیمی کنونشن، ۱۹۹۸ء)

ملت اسلامیہ کو اس ملک میں اپنے دینی وملّی تشخص کے ساتھ اگر زندہ رہنا ہے تو اس کے لئے از خود فیصلہ کرنا ہوگا اور اپنے بچوں کے لئے ایسی تعلیم کا بندوبست کرنا ہوگا جو ان کے اندر اسلامی شعور، اسلام کے اصول وعقائد پر یقین اور اسلامی سیرت سے متصف ہونے کی صلاحیت پیدا کر سکے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس وقت پورے ملک میں مسلم نوجوانوں کو گمراہ کرنے اور ارتداد پر ڈالنے کی ایک منظّم کوشش ہو رہی ہے۔ دوسری طرف مسلم عوام تعلیم سے بے نیاز ہو کر اجتماعی خودکشی کی راہ پر چل پڑی ہے۔ نئی نسل اپنے دین وعقیدہ سے برگشتہ نظر آرہی ہے۔ رسومات وخرافات کو دین سمجھ بیٹھی ہے اور اس کی ایک تعداد خدائے واحد کی بندگی سے ہٹی ہوئی ہے۔ ایسے حالات میں نہ ہمیں اطمینان سے بیٹھنا چاہیے اور نہ ہی کسی حکومت کی امداد کا انتظار کرنا چاہیے بلکہ اس کے لئے پورے عزم وہمت کے ساتھ مقدس ترین عبادت سمجھ کر عملی میدان میں کود پڑنا چاہیے اور صباحی وشبینہ مکاتب کا جال بچھا دینا چاہیے اور اس راہ کے مصارف کو دینی فریضہ سمجھ کر برداشت کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ دین کی تعلیم اور دین کی واقفیت کی وہی حیثیت ہے جو ایک انسان کے لئے ہوا پانی کی ہے۔

مفکر اسلام نے اپنے ایک خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ:

''بچوں کے عید کے کپڑے بنانے سے ہزار بار زیادہ اور بچہ بیمار ہو جائے تو اس کا بہتر سے بہتر علاج کرنے سے سیکڑوں بار زیادہ اور اپنے بچوں کو نوکری کے قابل بنانے سے لاکھ بار زیادہ یہ ضرورت ہے کہ اس کو سچا پکا مسلمان بنایا جائے۔'' (خطبۂ صدارت ضلعی کانفرنس لکھنؤ، ۱۹۹۳ء)

آخر میں مفکر اسلام کی دعا پر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں :

'' اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان کی حقیقی قیمت سمجھنے، اس کو دنیا کی ہر چیز پر، ہر دولت پر، ہر برتری پر، ہر لذت پر، اس کو ترجیح دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔''

☆☆☆

اصلاح معاشرہ

موبائل اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مولانا ندیم احمد انصاری، مہتمم مدرسہ نورِ محمدی، ممبئی

زمانہ چونکہ تغیر پذیر ہے، اس لیے اس میں مسلسل ایسے واقعات وحالات رونما ہوتے رہتے ہیں، جن سے یکسر الگ ہوکر زندگی گزارنا تقریباً محال ہے۔ معلوم ہے کہ ہر زمانے میں، اس دور میں زندگی جینے والوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ خود کو اپنے عہد یا زمانے کے تقاضے سے ہم آہنگ کریں، اور اگر کوئی فرد اس سے فرار اختیار کرتا ہے، تو اسے اس کا خمیازہ کسی نہ کسی طرح بھگتنا ہی پڑتا ہے۔

عصر حاضر میں انسان نے خداداد صلاحیتوں اور قوتِ فکر وتخیل کو استعمال کرکے جن جدید آلات کو ایجاد کیا ہے، ماضی میں اس کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ بر وبحر اور فضا تو کجا؟ آج انسان نے خود اپنے وجود تک کا ایک حد تک علم وتحقیق سے احاطہ کرلیا ہے۔ ان ایجادات میں ایک اہم کارنامہ ابلاغ ومواصلات کے ذرائع میں ہونے والی حیرت انگیز ترقی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ آج سے چند دہوں پہلے تک جو انسان اپنی بات کو چند فرلانگ تک پہنچانے سے قاصر تھا، آج ہندستان وغیرہ میں بیٹھے بٹھائے عرب وامریکہ تک اپنی آواز کو پہنچا سکتا ہے۔ اگر ان اشیاء کا موجد بادشاہ اکبر کے زمانہ میں ہوا ہوتا، تو ضرور بادشاہ اسے اپنے 'نو رتنوں' میں شامل کرلیتا۔ آج موبائل فون نے عصری لحاظ سے ایک ''جزءِ لازم' کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ کسی دن اگر کوئی شخص سہواً اپنا موبائل گھر پر بھول جائے، تو اسے سارے دن ایک عجیب بے چینی اور ایسی کمی کا احساس ہوتا رہتا ہے، جس کا تدارک 'لینڈ لائن فون' سے بھی ممکن نہیں ہو پاتا۔

گزشتہ چند سالوں میں موبائل کا استعمال بہت تیزی سے بڑھا ہے اور اس کے باعث انسانی رشتوں پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں، اور لوگوں کے باہمی تعلقات میں بہت فرق آیا ہے، یعنی موبائل نے انسانی زندگی کو بہت گہرائی تک متاثر کیا ہے۔ موبائل کسی سے رابطہ کا بہت ہی کارآمد ذریعہ ہے۔

موبائل کا استعمال مختلف النوع ہے۔ اس کے ذریعہ جہاں کسی سے بات چیت کی جاسکتی ہے، وہیں S M S اور M M S وغیرہ کے ذریعہ باوجود میلوں مسافت کے، باہم روابط قائم کیے جاسکتے ہیں۔ موبائل پر

انٹرنٹ کی سہولت نے اس کی افادیت میں چار چاند لگادیے ہیں، جس کے باعث کبھی بھی کہیں بھی SURFING بھی کی جاسکتی ہے، اور فوٹو، ویڈیو اور گیمس وغیرہ بھی ڈاؤن لوڈ کیے جاسکتے ہیں، نیز کسی کے ساتھ شیئر (SHARE) بھی کیے جاسکتے ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق دنیا بھر میں 15% انٹرنٹ کا استعمال صرف موبائل فون پر کیا جاتا ہے، جبکہ کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اور ٹیب لیٹ وغیرہ اس کے سوا ہیں۔ مزید لطف یہ کہ موبائل کے ذریعہ آفس کے بھی بہت سے کام کاج کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً: ورڈ آفس، مائکروسافٹ آفس وغیرہ۔ جو کہ بزنس وغیرہ کرنے والوں کے لیے بہت ہی کارآمد ہے۔

لیکن یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جہاں موبائل کے اتنے فوائد ہیں، وہیں بعض نقصانات بھی ہیں۔ اس میں سرفہرست کثیر الاستعمال ہونے کے باعث اس کے نیٹ ورک کا اعضاء رئیسیہ پر ہونے والے خطرناک اثرات ہیں، جس سے 'برین کینسر' تک کا امکان ہوتا ہے، اور موبائل کے اس بے سوچے سمجھے ہر وقت استعمال سے انسان کی قوتِ سامعہ وباصرہ وغیرہ جس طریق پر متاثر ہوتی ہے، وہ تو جگ دیکھی ہے۔ موبائل کے بڑھتے استعمال نے جگہ جگہ 'نیٹ ورک ٹاور' نصب کروائے ہیں، جو کہ انسانی آبادی کے لیے بے حد ضرر رساں ہیں۔ اس کے علاوہ موبائل کا ظالمانہ استعمال بھی ہمارے معاشرے کی ایک لعنت ہے، جہاں نظر ڈالئے بڑے اور بچے اسے بہت بے دردی سے استعمال کرتے ہیں، اور چیٹنگ یا گیم وغیرہ کے بہانے اس میں اتنا وقت ضائع کردیتے ہیں، جو اگر 'تعمیری کاموں' میں لگادیا جائے تو اس سے بہت خوش آئند فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ بچوں کا اس طرح گیم کھیلنا جہاں دوسرے بہت سے مضر اثرات ڈالتا ہے وہیں ان کی تعلیم وغیرہ کو بھی نمایاں طور پر متاثر کرتا ہے۔ نوجوان طبقہ کو تو موبائل نے گویا مکمل طور پر اپنا غلام بنالیا ہے۔ اولاً تو ان میں مہنگے سے مہنگا موبائل خریدنے کی ہوڑ لگی رہتی ہے، اور اس کے علاوہ نت نئے ایجاد ہونے والے VERSIONS انہیں اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہوگا کہ یہ اسباب کبھی بعض نوجوانوں کو بہت سی غلط راہوں پر لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایسے نوجوانوں کو صرف اسی پر بس نہیں ہوتا کہ وہ اچھا اور مہنگا موبائل خرید لیں، بلکہ وہ اس طرح موبائل میں منہمک رہتے ہیں کہ انہیں اپنے گرد وپیش کی خبر نہیں رہتی۔ یہ چیزیں بعض دفعہ حادثات کا بھی سبب بن جاتی ہیں۔

یہ بھی مشاہدہ ہے کہ موبائل فون کے ذریعے ہمارے سماج میں جھوٹ کو بھی بہت فروغ ہوا ہے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ اسے عیب بھی نہیں سمجھا جاتا۔ گھر پر آرام فرما ہوتے ہیں، اور کسی کا موبائل پر فون آتے وقت اسکرین پر اس کا نام دیکھ کر مختلف بہانے بنادیتے ہیں۔ مثلاً: نکل گیا ہوں، راستہ میں ہوں اور ٹرین میں ہوں وغیرہ۔ بعض دفعہ فون کرنے والے سے بچنا ہوتا

ہے،تو گھر کے کسی فرد سے کہلوا دیا جاتا ہے کہ کہہ دو گھر پر نہیں ہیں، موبائل گھر پر بھول کر کہیں چلے گئے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ایک باپ اپنی معصوم اولاد کے سامنے یہ حرکتیں کر رہا ہوتا ہے اور اس کے دور رس اثرات سے یکسر غافل ہوتا ہے، نتیجۃً ہمارے سماج میں جھوٹ کی وبا عام سے عام تر ہوتی جارہی ہے۔

موبائل کے مضر اثرات اور منفی پہلو میں ایک خطرناک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ ہماری نوجوان نسل فحش تصاویر، پھوہڑ ایس ایم ایس وغیرہ میں تباہ ہورہی ہے۔گندی ویڈیو اور مخربِ اخلاق گیت کے ذریعہ سے تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔

موبائل کے نقصانات وغیرہ کی بات کرتے ہوئے اس بات کو ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا کہ بعض دفعہ اس کی بیٹری پھٹ جانے سے بعض حادثات بھی پیش آتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ موبائل کے ذریعہ نسل نو میں تعیش پسندی اور آرام طلبی کا رجحان بڑھتا جارہا ہے، جو کُل قوم کے لیے نقصان دہ ہے۔

موبائل کے باعث ایک اور بہت اہم نقصان جو محسوس کیا جارہا ہے، وہ یہ کہ اس کے باعث لوگوں کی بالمشافہ ملاقات میں کمی آرہی ہے۔عموماً لوگ اپنے متعلقین سے بوقتِ ضرورت فون وغیرہ پر بات کرلینا کافی سمجھ لیتے ہیں، جسے بصارت کی نگاہوں سے دیکھا جائے،تو اس سے الفت ومحبت میں کمی واقع ہوتی ہے۔غالباً یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ صرف فون پر بات کر لینے سے انسان خودغرض ہوتا جارہا ہے۔اس لیے کہ کسی بھی خوشی یا غمی کے موقع پر وہ اپنے متعلقین کے یہاں حاضر ہونے کا متبادل گھر بیٹھے فون کر لینے کو سمجھنے لگا ہے۔

خلاصہ یہ کہ آج جبکہ تکنیکی ترقی کی پرواز نے دنیا کو ''آفاقی گاؤں'' میں تبدیل کردیا ہے، ایسی دنیا میں موبائل فون کے بغیر زندگی گزارنا کار دارد ہے،اس لیے کہ ہمیں ہر قدم پر اس کی ضرورت درپیش ہے۔یہی وجہ ہے کہ اب خاص وعام،شہری ودیہاتی، پڑھے لکھے و جاہل، امیر وغریب سب ہی موبائل فون رکھنے لگے ہیں،لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا موبائل مفید بھی ہے، اور مضر بھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان ان اشیاء کا محکوم نہ بن جائے، بلکہ اس کا استعمال ضرورت کے موقع پر ضرورت کے مطابق ہی کرے۔

موبائل کے مسائل

اسلام ایک ایسا کامل ومکمل دین ہے، جس میں چھوٹے بڑے، ہر عمل کے متعلق دینی رہنمائی بندوں کے سامنے پیش کی گئی ہے۔قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل کا حل شریعتِ اسلامی میں موجود ہے۔گذشتہ چند برسوں میں موبائل کا استعمال اس کثرت سے فروغ پاچکا ہے کہ امیر وغریب، شہری ودیہاتی، پڑھے لکھے اور جاہل سب اس کا استعمال کرنے لگے ہیں،اسی کے پیش نظر اس سے متعلق دینی رہنمائی پر مشتمل چند باتیں ہدیۂ قارئین کی جارہی ہیں۔

کیمرے والا موبائل خریدنا

کیمرے والے موبائل سے چوں کہ ایسے مناظر کی تصویر بھی لی جاسکتی ہے، جس میں کوئی جاندار نہ ہو، اس لیے کیمرے والے موبائل خریدنا مطلقاً ناجائز نہیں ہوگا، بلکہ اس کا ناجائز استعمال ہی ناجائز قرار دیا جائے گا۔ ایسے موبائل کی خرید وفروخت پر نفع اور اس کی Repairing کی اجرت بھی جائز ہے۔

موبائل میں ڈائون لوڈنگ کا حکم

موبائل میں ایسے پروگرام ڈالنا، جو مفید ہوں، نیز ان میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو، تو یہ عمل فی نفسہٖ درست ہے، اور اس پر نفع اور اجرت لینا بھی جائز ہے، لیکن موبائل میں گانے کی آوازوں، اسی طرح فحش تصاویر کی ڈاؤن لوڈنگ کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔ اور اس طرح کی ڈاؤن لوڈنگ پر اجرت لینا بھی جائز نہیں، اور اس کی آمدنی بھی حلال نہیں۔

موبائل کی ٹون

موبائل کی کالرٹون میں گانے وغیرہ اور میوزک لگانا ہرگز جائز نہیں، بلکہ سخت گناہ ہے۔ جو لوگ اپنے موبائل میں گانے وغیرہ کو اس طور پر سیٹ کرتے ہیں کہ جب انہیں کوئی شخص فون کرے، تو اسے گانا سنائی دے، اس طرح یہ عمل خود گنہگار بننے کے ساتھ اوروں کو بھی خواہ مخواہ گناہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کرنا ہے، لہٰذا جائز نہیں۔ البتہ کسی شخص کو ایسے آدمی سے رابطہ کرنے کی ضرورت پڑے، جس نے موبائل میں گانا فٹ کر رکھا ہو، اور اس بنا پر رابطہ کرنے والا بلا ارادہ مجبوراً گانے کی آواز سن لے، تو وہ گنہگار نہ ہوگا۔ انشاءاللہ چڑیا یا جانور وغیرہ کی آواز میوزک میں داخل نہیں۔

موبائل کی رنگ ٹون

موبائل کی رنگ ٹون میں اذان کے کلمات فیڈ کیے جائیں گے تو یہ اذان کا بے جا استعمال ہوگا، اور اسے بے ادبی سمجھا جائے گا۔ اور اگر بیت الخلاء وغیرہ میں یہ گھنٹی بجی تو قباحت اور بڑھ جائے گی۔ گویا کریلا نیم چڑھا۔

الارم کے لیے اذان

سونے والوں کو نماز کے لیے جگانا، یہ بھی اذان کے مقاصد میں ہے، اس لیے تہجد یا فجر یا کسی نماز کے لیے الارم گھڑی یا موبائل میں اذان کی آواز رکھنے کی گنجائش ہے۔

موبائل میں قرآن وغیرہ رکھنا

موبائل میں قرآن واحادیث اور ادعیہ ماثورہ وغیرہ محفوظ کرنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ اگر انہیں کھول کر چلایا جارہا ہو، تو اس حالت میں بیت الخلاء اور استنجا وغیرہ میں اس موبائل کو لے جانا سخت بے ادبی شمار ہوگا (جو کہ درست نہیں) تاہم اگر موبائل بند ہے یا وہ پروگرام بند ہے، جس میں آیات وغیرہ محفوظ ہیں، تو ایسی حالت میں موبائل کو استنجا خانہ وغیرہ میں لے جانا منع نہیں۔ اگر موبائل کی اسکرین پر قرآن کے حروف دکھائی دے رہے ہوں، تو ان حروف پر بلا وضو ہاتھ رکھنا بھی درست نہیں، لیکن اگر یہ

پروگرام بند ہوتو ایسے موبائل کو بلا وضو چھونا منع نہیں۔ یہی حکم ایسے اسکرین سیور اور وال پیپر کا ہوگا۔

موبائل سے دینی بیانات سننا

موبائل کے ذریعہ دینی بیانات یا نعتیہ نظموں وغیرہ کا سننا جائز ہے، بشرطیکہ اس میں تصاویر، میوزک، عورتوں اور اَمرد کی آواز نہ ہو۔

گھنٹی بجا کر کسی کو پریشان کرنا

موبائل کی گھنٹیاں بجا بجا کر کسی کو پریشان کرنا، ناجائز اور گناہ ہے۔ اور مِس کال کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ شخص جس کو مِس کال کی جارہی ہے، اس سے بے تکلفی ہے یا یہ علم ہے کہ وہ مِس کال دیکھ کر خود کال کرے گا تو اسے ناگواری نہیں ہوگی، تو ایسے شخص کو مِس کال کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر کسی اجنبی شخص یا ایسے شخص کو مِس کال کی جائے، جسے خود کال کرنے میں ناگواری ہو، تو یہ عمل درست نہیں۔

کال ویٹنگ سسٹم رکھنا

کال ویٹنگ سسٹم میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں قصداً ایذاءِ مسلم کا پہلو نہیں پایا جاتا، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص گھر میں کسی کام میں مشغول ہو، اور باہر سے آنے والا کوئی شخص گھنٹی بجا کر واپس چلا جائے۔

موبائل پر سلام

فون پر گفتگو کی ابتداء (ملاقات کی طرح) السلام علیکم سے کرنا بہتر ہے اور اگر فون اٹھاتے وقت یہ معلوم نہ ہو کہ فون کرنے والا مسلمان ہے یا غیر مسلم؟ اور فون اٹھانے والے نے بے خبری سے سلام کرلیا، تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ البتہ غیر مسلم کو جان بوجھ کر سلام کرنا ممنوع ہے۔ نیز ایک بار موبائل سے دعا سلام اور گفتگو وغیرہ کے بعد موبائل رکھ دیا جائے، پھر ایک آدھ منٹ کے بعد دوبارہ کال لگایا جائے، تو اسی طرح گفتگو سے پہلے سلام سے ابتدا کرنا مسنون ہوگا، جس طرح پہلی مرتبہ اور کال کے ختم پر بھی سلام کے ساتھ گفتگو ختم کرنا مسنون ہوگا۔

بلا اجازت کسی کی بات ریکارڈ کرنا

عام حالات میں بلا اجازت موبائل میں کسی کی گفتگو ریکارڈ کرنا جائز نہیں، کیونکہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''مجلسوں میں کہی ہوئی بات امانت ہے۔'' اور ریکارڈ کرنے کی وجہ سے یہ امانت محدود نہ رہ سکے گی، بلکہ دوسروں تک پہنچنے کا عین امکان ہے۔

کسٹمر کیر میں عورت سے گفتگو کرنا

بلا ضرورت اجنبی عورت سے بات چیت کی شریعت اجازت نہیں دیتی، لیکن اگر کوئی ضرورت درپیش ہو تو اجنبی عورت سے بقدر ضرورت بات چیت کی گنجائش ہے۔

دورانِ نماز موبائل بجنا

اولاً تو نماز کے وقت موبائل بند کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے، لیکن اگر کسی وقت غلطی سے موبائل بند کرنا رہ جائے اور دورانِ نماز گھنٹی بجنے لگے، تو عملِ کثیر کے بغیر گھنٹی

بند کرنا ممکن ہو تو بند کر سکتے ہیں، لیکن اگر گھنٹی بند کرنے کے لیے عملِ کثیر کرنا پڑے تو اس طرح موبائل فون بند کرنے سے نماز فاسد ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں موبائل بند نہیں کرنا چاہیے۔

نماز میں عملِ قلیل اور عملِ کثیر کی تعیین کے متعلق حضراتِ فقہاء کے جو اقوال منقول ہیں، ان میں سے راجح قول یہ ہے کہ ہر ایسا عمل کرنا جو نماز کی درستگی کے لیے نہ ہو اور نہ ہی نماز کے اعمال میں سے ہو، اور اس کے کرنے سے دور سے دیکھنے والے شخص کو غالب گمان ہو جائے کہ یہ شخص نماز میں نہیں ہے، تو یہ عملِ کثیر ہے، لیکن اگر وہ عمل اس حد تک نہ پہنچے تو وہ عملِ قلیل ہے۔

موبائل فون کو بلاشبہ پوری نماز میں تین مرتبہ عملِ قلیل کے ساتھ بند کرنا جائز ہے اور ایک رکن میں بھی تین بار عملِ قلیل کے ساتھ بند کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ پے در پے نہ ہو، یعنی تین مرتبہ سبحان ربی العظیم وغیرہ کہنے کے برابر یا اس سے کم وقت میں تین بار واقع نہ ہو، کیوں کہ اگر اس طرح پے در پے اتنے مختصر وقت میں تین حرکات واقع ہو گئیں، تو یہ عملِ کثیر ہو جائے گا اور اس سے نماز فاسد ہو جائے گی۔ یہ بھی خیال رہے کہ نماز کے دوران موبائل جیب میں رکھے رکھے بند کیا جا سکتا ہے، لیکن جیب سے نکال کر بٹن وغیرہ دیکھ کر بند کیا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

کسی کے موبائل کی گھنٹی بجنے پر نماز میں خلل وغیرہ کا اندیشہ ہو تو پاس میں بیٹھے ہوئے شخص کو موبائل والے کی اجازت کے بغیر بھی اس کا موبائل بند کر دینا جائز ہے، بلکہ ایک طرح سے اس کے ساتھ ہم دردی اور تعاون ہے۔

موبائل پر آیتِ سجدہ

موبائل میں آیتِ سجدہ وغیرہ فیڈ کی ہوئی ہو اور وہ چلائی جائے تو اسے سننے سے سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوگا، اور اگر کوئی شخص اسی وقت اس پر تلاوت کر رہا ہو، تو سجدۂ تلاوت واجب ہو جائے گا۔

موبائل سامنے رکھ کر نماز پڑھنا

نمازی کا موبائل اپنے سامنے رکھ کر نماز پڑھنا اچھا نہیں، مکروہِ تنزیہی ہے، اس لیے کہ یہ فعل خشوع میں خلل ڈالنے والا ہے۔ اور بعض اوقات وائبریشن پر ہونے کی صورت میں آس پاس والوں کی نماز میں بھی خلل ہوگا۔

موبائل بند کرنے کا اعلان کرنا

چونکہ اب موبائل کا استعمال بہت عام ہو گیا ہے۔ اس لیے ضرورت کی بنا پر جماعت سے قبل موبائل بند کرنے کا اعلان نہ صرف جائز بلکہ مناسب ہے، تاکہ دورانِ نماز موبائل کی گھنٹی بجنے سے نماز میں خلل واقع نہ ہو۔

☆☆☆